ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

دسمبر ۲۰۱۷ء | جلد ۹ | شمارہ ۶ | ربیع الاول ۱۴۳۹ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9808850029
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00روپے
سالانہ:	250:00روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ 202002

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com, visit us: www.nadwifoundatioaligarh.org

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at *Ideal Graphics Enterprises*, Patwari Nagla, Aligarh

Dsg. & Comp. by: Abdur Rehman Araria, # arehman412@yahoo.in

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	احسان نہ جتلاؤ	محمد عارف ندوی	
۲۔	افتتاحیہ	حضور ولی عہد کا ''معتدل اسلام''	مدیر	۳
۳۔	انکار حدیث	موضوع حدیث اور اس کی علامات	محمد فرید حبیب ندوی	۲۰
۴۔	فقہی مقالات	سرکاری اسکیموں سے استفادہ اور حکم شریعت (قسط.۱)	مولانا محمد قمر الزماں ندوی	۲۳
۵۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۳۰
۶۔	ماضی کے دریچے سے	مسلم یونیورسٹی سیکولرازم کا ایک نشان	مولانا شاہ معین احمد ندویؒ	۳۳
۷۔	شخصیات	سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی تاریخ نگاری	مولانا عمیر الصدیق ندوی	۳۶
۸۔	اسلامی تعلیمات	حب دنیا کا علاج سورہ ''والعادیات'' کی روشنی میں	ترجمہ: طلحہ نعمت ندوی	۴۰
۹۔	اسلامی معاشرہ	مفکر اسلام- ایک مطالعہ (قسط-۲۱)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۴۲
۱۰۔	لائحہ عمل	ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مولانا آزاد کی رہنمائی	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۴۴
۱۱۔	زبان و ادب	سخن کی تابانی: قدر تابانی	زبیر احمد صدیقی	۴۷
۱۲۔	تعارف و تبصرہ	اسلام کا نظام سیاست وحکومت	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۵۴
۱۳۔	اعلان	مسابقہ بین المدارس	ادارہ	۵۸
۱۴	آخری صفحہ	اسلام میں سب برابر ہیں	م۔ق۔ن	۶۴
۱۵۔	شعر وادب	جشنِ ولادت	ماہر القادریؒ	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

افتتاحیہ

حضور ولی عہد کا ''معتدل اسلام''

ہم نے اب تک یہی جانا تھا، پڑھا تھا اور سمجھا تھا کہ دین اللہ کے نزدیک ''الاسلام'' ہے، لیکن حضور ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان نے بتایا کہ دین صرف الاسلام نہیں بلکہ ''معتدل اسلام'' بھی ہے، آخر یہ ''معتدل اسلام'' کون سی بلا ہے، اس کی جڑیں کہاں سے ملتی ہیں، اس سے کیا مراد ہے، یہ کس کی مرضی سے اختیار کیا جائے گا، اس کا کیا مقصد ہوگا ایسے بہت سارے سوالات ذہن میں اٹھ رہے ہیں۔ حضور ولی عہد نے فرمایا کہ وہ ''مملکت میں معتدل اسلام کی واپسی کر رہے ہیں'' ان کا کہنا ہے کہ ''سعودی عرب ۱۹۷۹ء سے قبل ایسا نہیں تھا'' اس لیے انھوں نے واضح کیا کہ ہم اسی طرف واپسی کر رہے ہیں جہاں ہم پہلے تھے، یعنی سعودیہ ایک معتدل اسلامی ملک جو دنیا کے تمام مذاہب کے لیے کھلا ہوا تھا، اس ''معتدل اسلام'' کی بحالی کے لیے حضور ولی عہد قتل وخون اور قید و بند کا کھیل کھیل رہے ہیں، مشہور ترین علماء کو پابند سلاسل کر دیا گیا ہے، سینکڑوں غائب ہیں، خاندان میں اقتدار کی جنگ جاری ہے، حضور ولی عہد نے متعدد شہزادوں کو نظر بند کر دیا ہے، کچھ کا تو پتہ ہی نہیں کہاں گئے، بعض خبر رساں اداروں کے مطابق متعدد شہزادے قتل کر دیے گئے ہیں، خاندان کی دوسری شاخوں میں تقسیم وزارتوں کو ''بدعنوانی'' کا خوشنما الزام دے کر اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور وزیروں کو سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا ہے، ''معتدل اسلام'' کی بحالی کے لئے اخوان جیسی پرامن تنظیم کے نام پر پکڑ دھکڑ اور ٹارچر کرنے کا سلسلہ جاری ہے، ایسا لگتا ہے کہ اب حضور ولی عہد کچھ دنوں کے لئے یا تو طاقتور ترین بادشاہ بن جائیں گے یا ہوسِ اقتدار انھیں تاریخ کی اس فہرست میں شامل کر دے گی جس پر نظر پڑتے ہی تعوذ وحوقلہ کے کلمات خود بخود زبان پر آجایا کرتے ہیں۔

حضور ولی عہد نے منشاء ظاہر کی ہے کہ وہ سعودیہ میں ریزارٹ بنائیں گے جہاں اختلاط اور بے حیائی وفحاشی پر کوئی روک ٹوک نہ ہوگی، آئندہ سال موسیقی وغیرہ کا میلہ لگانے کا بھی عندیہ دیا ہے، حضور ولی عہد کی سربراہی میں رابطہ عالم اسلامی کی ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جس کا نام ہے "لجنة دائمة للتواصل بين الفاتيكان ورابطة العالم الاسلامی" یہ کمیٹی ویٹیکن چرچ سے مستقل رابطہ رکھنے کے لئے بنائی گئی ہے، حضور ولی عہد کا خود مستقل رابطہ نیتن یاہو سے ہے، گزشتہ مہینہ خفیہ طور پر اسرائیل کی سیر سے لوٹے ہیں، ہزاروں ائمہ کو ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا گیا ہے، وائٹ ہاؤس کی نگرانی وسرپرستی میں قائم ریاض دفتر کے توسط سے اب نئے ائمہ کا تقرر ہوگا جو معتدل فکر کے حامل ہوں گے۔

سطور بالا سے محسوس ہوا ہوگا کہ اسلام کا طوق غلامی گردن سے اتار پھینکنے، ناچنے تھرکنے، اسلام کے علاوہ دیگر تہذیبوں

کے رنگ میں رنگنے، قرآن کو بالائے طاق رکھنے، دین کو مسجد ومصلی تک محدود کرنے اور شریعت کو کھرچ کھرچ کر پھینکنے، اسلامی نظام کے تصور کو ذہنوں سے مٹانے اور مغرب کی بالادستی قبول کرتے ہوئے اس کے اشارے پر چلنے کا نام حضور ولی عہد کی نظر میں ''معتدل اسلام'' ہے، حضور ولی عہد کے اقدامات سے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ اتاترک کی راہ چل پڑے ہیں، یاد رکھنے کی بات ہے کہ اسلام کے اصولوں میں اور عقائد میں اور خدا کی بندگی اختیار کرنے میں اعتدال کا کوئی دخل نہیں، اعتدال عدل سے مشتق ہے اور عدل نام ہے افراط وتفریط سے اجتناب کا، سیدھا ہونے اور سیدھا کرنے کا، افراط وتفریط سے اجتناب تب ہی ممکن ہے جب ''اسوۂ حسنہ'' کلی اتباع کی جائے، اسوہ حسنہ نے اسلام کے جس ایڈیشن کو پیش کیا ہے وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات اور زندگی کے تمام شعبوں پر محیط دین ہے، اس کا ہرگز یہ نظریہ نہیں کہ ''قیصر کا حق قیصر کو دیا جائے اور خدا کا حق خدا کو دیا جائے''، وہ تو عبادات و معاملات واقتصادیات ومعیشت ودفاع وانتظام وسیاست اور تمام شعبہ ہائے زندگی کے لیے رہنما احکامات رکھتا ہے، وہ مکمل اتباع کا مطالبہ کرتا ہے، خود سپردگی کا تقاضہ کرتا ہے، سورہ آل عمران میں واضح ارشاد ہے إن الدين عند الله الاسلام (۱) (ترجمہ: نظامِ حیات، اور اطاعت کے طریقۂ کار کا نام اسلام ہے) دین طریقہ روش اور نظام حیات کو کہا جاتا ہے، یعنی صرف ایک ہی ایسا نظام زندگی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے توسط سے انسانوں کو دیا ہے وہی قابل قبول ہے، اس میں کسی کی پسند وناپسند، کسی کے اختیار وایجاد اور کسی کے دخل کی کوئی گنجائش نہیں، اس طریقہ زندگی یعنی دین کو الاسلام سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کی بابت دوسری جگہ یہ ارشاد فرمادیا گیا ہے کہ ومن يبتغ غير الاسلام دينا فلن يقبل منه (۲) (ترجمہ: اور جو اسلام کے علاوہ کسی مذہب اور نظام کا طلب گار ہوگا، ہرگز اسے قبول نہیں کیا جائے گا) یہ ''الاسلام'' کیا ہے؟ اس کے معنی ہیں سپردگی اور تابعِ فرمان ہوجانا، جس زمانے میں انبیائے کرام جو کچھ لے کر آئے اس کے سامنے جھک جانا، آخری نبی حضرت محمد ﷺ جو آخری اور ابدی طریقہ لے کر آئے اس کو قبول کرنا، اس کا اعتراف کرنا، اس کو لازم پکڑنا اور اعمال میں اس کا اظہار کرنا، اسلام نام ہے مکمل اطاعت اور اتباع کامل کا، یہ دین اللہ کا وہ دین ہے جو طریقۂ زندگی اور معیار زندگی ہے، جو میزان عدل ہے، اسی کا نفاذ تمام کائنات میں ہوگا، تمام انبیاء ورسول جو دین لائے وہ ''الاسلام'' ہی تھا، عقائد واصول ایک تھے البتہ شریعتوں میں وقت وحالات اور قوموں کے مزاج کے اعتبار سے اللہ نے فرق رکھا، بغض وعناد، سرکشی وشیطنت کے باعث دین کے جو بھی نام رکھ لیے گئے، یہودیت کہا گیا یا نصرانیت مگر دین جو اتارا گیا تھا وہ تو الاسلام ہی تھا، اسی کو حتمی وقطعی اور عالمی وابدی دین کی حیثیت سے حضرت محمد ﷺ پر اتارا گیا اور سب کو پھر اسی کے قبول کرنے کا پابند کردیا گیا فرمایا گیا:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۳)

(ترجمہ: اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا ہے، جو تمہیں کھول کھول کر کتابِ الٰہی کی بہت سی ایسی باتیں بتا رہا ہے جن کو تم چھپاتے تھے، اور بہت سی باتوں کو تو چھوڑ رہا ہے، تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشن اور واضح کتاب آگئی ہے،

جس سے اللہ ان لوگوں کو سلامتی کے راستوں کی ہدایت ورہنمائی عطا فرما رہا ہے، جو اس کی خوشنودی اور رضامندی کی باتوں کی پیروی کرتے ہیں، اور ان کو تاریکیوں سے نکال کر اپنے حکم سے روشنی میں لا رہا ہے، اور ان کو صراط مستقیم کی طرف لے جا رہا ہے، اور اس پر استقامت عطا فرما رہا ہے)۔

اور فرمایا: يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴) (ترجمہ: اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارے پیغمبر، پیغمبروں کے ایک وقفہ کے بعد آ گئے جو حقائق کو کھول کھول کر بیان کر رہے ہیں، تاکہ تمہیں یہ کہنے کا موقعہ نہ رہے کہ ہمارے پاس کوئی (بشیر ونذیر) خوشخبری دینے اور ڈرانے والا نہیں آیا، تو (سن لو کہ) تمہارے پاس بشیر ونذیر آ گئے ہیں، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)۔

اسی اسلام کی ترجمانی کے لیے حضرت نوحؑ کی زبان سے کہلوایا گیا وامرت أن أكون من المسلمين (۵) (ترجمہ: تو اس کا حکم ہے کہ میں مسلمان رہوں (اللہ کا سچا فرمانبردار رہوں)، حضرت ابراہیم سے دعا کرائی گئی کہ ربنا واجعلنا مسلمين لك ومن ذريتنا امة مسلمة لك (۶) (ترجمہ: اے ہمارے مالک! ہم کو اپنا مکمل فرمانبردار اور مطیع بنا دے، اور ہماری اولاد میں ایک فرمانبردار اور اطاعت کرنے والی امت پیدا فرما دے۔) حضرت عیسیٰ سے کہلوایا گیا واشهد بانا مسلمون (۷) (ترجمہ: اور گواہ رہیے کہ ہم مسلم ہیں (اطاعت گزار اور فرمانبردار ہیں)۔ خود حضور پاک علیہ السلام کو یہ تفصیلی وضاحت کرانے کا حکم دیا گیا قل ان صلاتی و نسکی ومحیای ومماتی لله رب العلمين لا شريك له وبذلك أمرت وانا اول المسلين (۸) (ترجمہ: کہہ دیجئے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہے جو سب کا مالک و پروردگار ہے، اور جس کا کوئی شریک نہیں، اور مجھے اسی کا حکم فرمایا گیا ہے، اور میں (تمہارے درمیان) پہلا مسلمان ہوں) پھر یہ مطالبہ بھی بہت صراحت کے ساتھ کیا گیا يا ايها الذين آمنوا ادخلو فى السلم كافة ولا تتبعوا خطوات الشيطان (۹) (ترجمہ: اے ایمان والو! اسلام میں مکمل طور پر (پورے اسلام میں کلی طور پر) داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے) ان سب نصوص پر غور کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ اصول وعقائد میں اعتدال کی کوئی گنجائش نہیں، ان کا اعتدال یہی ہے کہ وہ افراط وتفریط سے پاک ہوں، احکامات پر عمل کی کیفیت میں افراط وتفریط سے اجتناب کو معتدل عمل اور معتدل فکر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، لیکن ''معتدل اسلام'' کا نام دے کر اس کے نظام سے، اس کے احکام سے دامن بچانا اور پیچھا چھڑانا ممکن نہیں، سورہ آل عمران کی آیت مذکور ان الدين ..... کے بعد والی آیت میں حضور اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ اگر اسلام کی حقانیت کے ثابت ہو جانے اور اس کے دین برحق ہونے کے دلائل واضح طور پر بیان کر دینے کے باوجود بھی وہ آپ ﷺ سے حیل وحجت کریں تو ان سے کہیے کہ تم مانو یا نہ مانو میں نے تو اپنا منہ اللہ کی طرف کیا، اپنا رخ اللہ کی طرف کیا، اپنا چہرہ اللہ کے سپرد کر دیا (۱۰)، مولانا امین احسن اصلاحی نے بڑے نکتہ کی بات فرمائی ہے اور اس آیت کی بڑی دلنشین تشریح کی ہے:

''(میں نے اپنا چہرہ اللہ کے حوالے کیا) اپنی ذات کو اللہ کے حوالے کرنے کی تعبیر ہے۔ چہرہ انسان کی ذات کا سب سے اعلیٰ واشرف حصہ ہے۔ جب سب سے اعلیٰ واشرف حصہ حوالے کر دیا تو گویا سب کچھ حوالے کر دیا۔ یہ اسی طرح کی تعبیر ہے جس طرح ہم کسی کی اطاعت کی تعبیر کے لیے سر جھکا دینا بولتے ہیں، اس تعبیر میں غایت درجہ تذلل و نیازمندی اور سپردگی پائی جاتی ہے، موقع دلیل ہے کہ یہاں یہ اسلوب اصلا تو اسلام لانے کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن ساتھ ہی اس سے اسلام کی اصل روح بھی واضح ہوگئی ہے تاکہ دینداری کے ان مدعیوں کو، جو اسلام کی مخالفت میں بحث وجدال کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے تھے، تنبیہ ہو کہ وہ کس چیز کے خلاف یہ زور دکھا رہے ہیں''۔(۱۱)

مسلمان اگر عزت چاہتے ہیں، وقار چاہتے ہیں، فلاح ونجات دنیوی واخروی چاہتے ہیں تو ان کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ پورے خضوع وتذلل کے ساتھ اسی ''الاسلام'' کو اختیار کریں، صرف اس کے ظاہر کو نہیں بلکہ اس کے ظاہر وباطن اور اس کے مغز وروح کے ساتھ اس کو مکمل طور پر اپنائیں، اس کے لیے خود تراشیدہ بلکہ مغرب کی وضع کردہ اصطلاحات Terminalogies کی ضرورت نہیں ہے، اس کے لئے حضور ولی عہد کے ''معتدل اسلام'' کی ضرورت نہیں ہے جس کی طرف مردآہن رجب طیب اردغان نے اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ''اسلام صرف ایک ہی ہے نہ وہ معتدل ہے نہ غیر معتدل کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق ہمارے دین کی تشریح کرے''، کامیابی کے لیے ضرورت ہے کہ نبی ﷺ کا اسوہ حسنہ اور آپ ﷺ کے صحابہ کا طریقہ اس طور پر اپنایا جائے کہ قدم قدم پر عبادت ومعاملات میں ان ہی کا اسوہ اختیار کیا جائے، امن وجنگ میں ان ہی کی سیرت سے روشنی حاصل کی جائے، جرأت وغیرت، حرارت وحمیت، حکمت ومصلحت، دعوت وعزیمت، سیاست اور تفکیر وتدبیر غرض ہر پہلو سے اسی عالمی ومثالی طریقہ سے رہنمائی حاصل کی جائے جس کو ''الاسلام'' کی شکل میں اتارا گیا اور جس کی بابت یہ فرمایا گیا وان هذا صراطی مستقیما فاتبعوه (۱۲)(ترجمہ: اور یہ ہے میرا سیدھا راستہ، اس کی پیروی کرو) اسی کی تشریح کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے ایک خط کھینچا اور فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے، پھر اس کے دائیں بائیں اور لائنیں کھینچی اور فرمایا یہ اور راستے ہیں، ان میں سے ہر راستے پر شیطان ہے جو اپنی طرف بلا رہا ہے، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت وان هذا صراطی ..... تلاوت فرمائی (۱۳)

اب اگر اس صراط مستقیم کی اتباع کی جائے تو ''معتدل اسلام'' کی ضرورت نہیں رہ جاتی بلکہ ضرورت اس کی رہ جاتی ہے کہ نبی کے اسوہ کو سامنے رکھتے ہوئے پہلے ایمان وعقیدے کی اصلاح کی جائے، نبی اکرمؐ نے سب سے پہلے عقیدہ توحید کو درست کیا اور اسی کی دعوت دی، امام مالک کا یہ بہت مشہور مقولہ ہے لا یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح علیه اولها، توحید پر ایمان پختہ ہوگیا تو پھر اخلاقی، اقتصادی، تجارتی سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی اصلاح خود بخود ہوتی گئی اور کہیں کوئی دشواری ہی پیش نہیں کرتی، **افسوسناک صورت حال یہ ہے کہ کہ جس ملک کو لوگ ''مملکت توحید'' کہتے ہیں اسی ملک میں اسلام کے حصے بخرے کیے جارہے ہیں، وہاں الفاظ کی دھاندلی چل رہی ہے، وہاں سے فکر اسلامی کو نکالا جارہا ہے، اگر مملکت توحید کے فرمانروا نے توحید کا مکمل سبق پڑھا ہے تو پھر نظم ونسق میں، انتظام مملکت میں، نفاذ شریعت میں، سیاسیت خارجہ وداخلہ میں، دفاعی اقدامات**

میں، اعدادقوت میں، تجارت ومعیشت میں، بینکوں کے نظام میں توحید کے تقاضے اور توحید کے مظاہر کیوں نہیں، پھر اپنا سر اور اپنی دستار امریکہ واسرائیل کے قدموں میں کیوں رکھ دی، ملمع سازی ہے، کلمہ حق سے باطل مقاصد حل کیے جارہے ہیں، مگر یہ ایسا نخل تمنا ہے جس کا سوکھ جانا یقینی ہے یہ ایسی آرزو ہے جس کا مکمل نہ ہونا قدرت الٰہی کی طرف سے طے شدہ ہے۔

محمد بن سلمان کی زبان سے ''معتدل اسلام'' کی اصطلاح نکلی تو محسوس ہوا کہ اب تو حضور ولی عہد کے منہ میں زبان بھی امریکہ کی رکھ دی گئی ہے، کیوں کہ اس اصطلاح کا استعمال امریکہ ہی کی جانب سے سب سے پہلے کیا گیا، جب روس اور اسکے سوشلزم وکمیونزم کی بساط لپیٹ دی گئی، عالمی قیادت امریکہ بہادر کے ہاتھ آئی جو کہ کیپٹلزم Capitalism کا نمائندہ تھا، تو اس نے اسلام کو اپنا حریف بنایا، اسلام سے خطرہ کا اظہار کیا جانے لگا، مغرب سے متعدد آوازیں اٹھنے لگیں، امریکہ جانتا تھا کہ اس کی تہذیب اور اس کا نظریہ کیپٹلزم اسلام کا کسی سطح پر حتی کہ فکری سطح پر بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا، محمد بن سلمان نے اپنے بیان میں ذکر کیا ہے کہ ۱۹۷۹ء میں الصحوۃ الاسلامیہ کی تحریک شروع ہوئی اور ہمیں اس سے پہلے والی حالت میں واپس جانا ہے، گویا اصل عداوت الصحوۃ سے ہوئی، عالم عربی اور عالم اسلامی کا یہ وہ زمانہ تھا جب امت نے انگڑائی لی تھی، بیداری کی مہم مختلف حیثیتوں سے اٹھی تھی حتی کہ کچھ سالوں کے بعد سوویت یونین کا غرور افغانستان کی خاک میں دفن ہوگیا تھا، امریکہ بلکہ پورے مغرب کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں حکومت، ریاست، زندگی اور معاشرے میں اسلام کی حکمرانی واپس نہ آجائے، کیوں کہ مختلف تحریکات کی کوششوں کے نتیجہ میں امت میں یہ شعور پیدا ہونے لگا تھا کہ اس کی کامیابی وکامرانی کا راز ''الاسلام'' کی اتباع کامل میں ہے، اس کو یہ بات سمجھ میں آنے لگی تھی کہ عالم اسلامی بلکہ عالم انسانیت کی نجات وکامرانی کا واحد راستہ اسلام کی طرف رجوع، اس کو زندگیوں میں اتارنے اور حکومت وریاست پر اس کو نافذ ومنطبق کرنے میں ہے، امریکہ نے اپنے دفاع وتحفظ کا جو راستہ اختیار کیا وہ وہی تھا جس کی بنیاد پہلے سے انگریز ڈال چکے تھے، چنانچہ اس نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی کی مہم کے لیے استعمال کیا، یہی نہیں بلکہ اسلام کو متہم کرنے کے لئے بھی مسلمانوں کا استعمال کیا، چنانچہ اصولی اسلام، اسلامی دہشت گردی، متشدد اسلام، جمہوری اسلام، وہابی اسلام، صوفی اسلام جیسی باطل وبے بنیاد اصطلاحات کو رواج دیا گیا، خاص طور پر الاصولیۃ الإسلامیۃ، (Islamic fundamentalism) الاسلام المتطرف اور الارهاب الاسلامی کا اس کثرت سے استعمال کیا گیا کہ لوگ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اسلام میں دہشت گردی بھی کوئی چیز ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ آپس ہی میں برسرِ پیکار ہوگئے، الزامات ودفاع کا دور چلا، امریکہ بہادر کسی کا حلیف اور کسی کا حریف بنا، اس کے استحکام کو ہی نہیں اس کی سربراہی و سرداری کو استحکام ملا، الاصولیۃ الاسلامیۃ Islamic Fundamentalism سے مغرب کو ویسے ہی خطرہ محسوس ہونے لگا جیسے کبھی اس کو کمیونزم سے خطرہ محسوس ہوتا تھا، اسرائیل وامریکہ اسکو خطرہ باور کرانے میں پیش پیش رہے، ان کے رہنماؤں کے سینکڑوں بیانات تاریخ نے ریکارڈ کیے ہیں جن میں انھوں نے ''اصولی اسلام'' کو دنیا کا سب سے بڑا خطرہ شمار کیا، بعد میں اس کو ''ارہابی اسلام'' سے بھی تعبیر کیا گیا، ہم یہاں ان کے بیانات نقل کرنے کے بجائے یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ یہ الاصولیۃ الاسلامیۃ ہے کیا؟ اس کو ایک یہودی نے وبا قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ صرف یہودیت کے لیے نہیں بلکہ پوری بشریت کے لئے

خطرہ ہے، آگے چل کر اسی کو اسلاموفوبیا سے جوڑ کر باعمل مسلمانوں کے خلاف ایک الگ ہی مہم چلائی گئی، اصولیہ کی جو بھی تعریفات کی گئی ہیں **ان سے قطع نظر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب نے رفتہ رفتہ اسلام کی صحیح اور مکمل فکر اور اس کے جامع تصور کو ہی انتہا پسندی، اصولیت، تشدد اور دہشت گردی سے تعبیر کر دیا، اگر قرآن پڑھا جائے، کلمہ کا ورد کیا جائے، نماز پڑھی جائے روزہ رکھا جائے تو اسے کوئی پریشانی نہیں بلکہ کٹر سے کٹر دشمن افطار پارٹی دینے کو تیار رہتا ہے، البتہ اگر اسلامی نظام کی بات کی جائے، اسلام کے طریقہ حکومت وسیاست، اسلام کے طریقہ تجارت ومعیشت ومعاشرت کی بات کی جائے، اسلامی تربیت کی بات کی جائے تو مغرب چیں بہ جبیں ہو جاتا ہے، وہ اسلامک اسٹڈیز کے بڑے بڑے سینٹر تو کھول سکتا ہے، انھیں امداد فراہم کر سکتا ہے، مگر اسلامی فکر وتربیت کے لیے قائم ایک چھوٹے سے مدرسہ کو دہشت گردی کا اڈا اقرار دینے میں دیر نہیں کرتا، اس کو اسلام کا وہ نمائندہ پسند ہے جس کے ذہن سے دین کا تصورِ کامل محو ہو چکا ہو، وہ صرف اس کے حصہ عبادات کی رٹ لگاتا ہو، اخلاقیات، معاملات وسماجیات سے آنکھیں چراتا ہو، اسلام کے اسی جامع وکامل تصور ــــــ جو خود ''الاسلام'' سے عبارت ہے ــــــ متشدد اسلام اور اصولی اسلام کا نام دیا گیا**، معروف سیاسی مفکر ڈینیل پائپس (Daniel Pipes) نے کہا تھا کہ ''تشدد پسند اسلام ایک مشکل ہے اور اس کا حل معتدل اسلام ہے۔ Radical Islam is the problem and Moderate Islam is the solution(۱۴) **قارئین بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ معتدل اسلام کے ڈانڈے کہاں سے ملتے ہیں اور حضور ولی عہد سعودیہ میں اسلام کا کون سا ماڈریٹ ورزن پیش کرنا چاہتے ہیں، وہ اسلام کا ایسا ایڈیشن ہوگا جس میں نماز اللہ کے لیے پڑھی جائے گی، معاشرت کھلے عام امریکی طرز کی ہوگی حکومت طاغوتی ہوگی، کتاب وسنت کے احکام کو پس پشت ڈال دیا جائے گا، ان ہی مقاصد کے حل کے لیے مجمع الملك سلمان للحديث قائم کر دیا گیا، معتدل فکر کی ترویج اور وہاں موجود کتب وعناصر اور شخصیات کی تنقیح کے لیے ریاض میں دفتر پہلے ہی قائم ہو چکا ہے۔**

مجلۃ الزیتونہ کے ایک مضمون نگار یاسین بن علی نے انسائیکلو پیڈیا آف اسپیکٹرم سے اصولیہ اسلامیہ کی تعریف نقل کی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ یہ ایک ایسی جامع اصطلاح ہے جو متعدد ایسی جماعتوں پر منطبق ہوتی ہے جو اسلام کو ایک سیاسی ہتھیار سمجھتی ہیں، جو اسلامی ریاست کا قیام چاہتی ہیں، جو ملکوں کے نظام میں شریعت کا مکمل نفاذ چاہتی ہیں''۔(۱۵)

شمعون پیرز نے شیوعیت (Communism) کے خاتمہ کے بعد اصولیت (Fundamentalism) کو سب سے بڑا خطرہ قرار دیا(۱۶)، ۹/۱۱ کے واقعہ کو اسی فکر سے جوڑ دیا گیا پھر عالمی منظر نامہ پر جو ڈرامائی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ اسلام کی بیخ کنی کے لیے امریکہ نے کس کس طرح کے حربے استعمال کیے، امریکہ نے دراصل ۲۰۰۱ء میں ''معتدل اسلام'' کو فروغ دینے کے لئے ایک مکمل اور باضابطہ مہم شروع کی تھی اور اس کا مکمل خُطہ تیار کیا تھا۔ اس خُطہ پر مکمل طریقہ سے عمل کرنے کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ مسلمانوں کو آپس میں تردید ودفاع کے ذریعہ فروعی مسائل میں اس طرح الجھا کر رکھا جائے کہ بنیادی اور ضروری مسائل سے وہ غافل رہیں، اس کے لیے ایک طرف تو سعودیہ نے اس کے خاکے میں رنگ بھرنے کی اس کی خواہش پوری کی، اس نے ایسے متشدد گروہ کو ریال کی مدد سے تیار کیا جس نے تکفیر کی مہم چھیڑ دی اور گاؤں گاؤں،

مسجد مسجد اکھاڑہ بنا دیا، دوسری طرف خود امریکہ نے گزشتہ پندرہ-بیس سالوں میں ایسے لوگوں کی ایک کھیپ تیار کی جو امت میں تشکیکی مزاج کی تشکیل کریں، اس سلسلہ میں اس نے دوسرا اہم اقدام یہ کیا کہ اسلام کے سیاسی نظام کو خطرہ باور کرنے کے لئے مغرب کی رائے عامہ ہموار کی، اس نے اس کو ''سیاسی اسلام'' قرار دے کر پروپیگنڈہ مہم چھیڑی، اس کی بیخ کنی پر سب کو متفق کیا اور یہ طے کیا کہ جو اسلامی سیاست کا داعی ہو اس کے خلاف جنگ واجب ہے، تیسرا بڑا کام امریکہ نے یہ کیا کہ وسطیت واعتدال کا نعرہ دیا اور اسکے لیے ایسے لوگوں کو استعمال کیا جو وسطیت واعتدال کا نام لے کر ایک نئے اسلام کی تشکیل کریں، اس لیے کہ جس وسطیت واعتدال کی تعلیم قرآن مجید نے دی ہے وہ عدل وقسط پر قائم ہے، اسی کے سبب اس امت کو شہادت علی الحق کے منصب پر فائز کیا گیا ہے، وسطیت واعتدال کا ہرگز وہ مطلب نہیں جو امریکہ اور اس کے حلیف سمجھتے اور بیان کرتے ہیں کہ اسلام کے احکامات سے دست بردار ہوا جائے، حق کو حق نہ کہا جائے اور باطل کو باطل نہ قرار دیا جائے، احقاق حق اور ابطال باطل سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے، قرآن مجید میں یقیناً اس امت کو امت وسط قرار دیا گیا ہے اس کی بھی غلط تشریح کی جاتی ہے، ارشاد الٰہی ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ الرَّحِيْمٌ (۱۷) (ترجمہ: ہم نے اسی طرح (اے مسلمانو!) تم کو درمیانی اور افضل امت بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں کے سامنے (حق کے) گواہ رہو اور پیغمبر تمہارے سامنے حق کے گواہ رہیں۔ جو قبلہ ہم نے (پہلے) مقرر کیا تھا، اور تم اس کی طرف رخ کر رہے تھے، اس کا مقصد یہ تھا کہ دیکھیں کون پیغمبر کی پیروی کرتا ہے اور کون ارتداد کا شکار ہوتا ہے، یہ تبدیلی بڑی گراں بار تھی، لیکن جن کو اللہ نے ہدایت سے نواز رکھا ہے، ان کے لئے نہیں، اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ضائع نہیں فرماتا، اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ بہت شفقت فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے)۔ مولانا مودودیؒ اس موقع پر رقم طراز ہیں:

''امت وسط کا لفظ اس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا، اس سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے، جو عدل وانصاف اور توسط کی روش پر قائم ہو، جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو، جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناروا تعلق کسی سے نہ ہو، پھر یہ جو فرمایا کہ تمہیں امت وسط اس لئے بنایا گیا ہے کہ ''تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں، تو اس سے مراد یہ ہے کہ آخر میں جب پوری نوع انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا، اس وقت رسول ہمارے ذمہ دار اور نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا، فکر صحیح اور عمل صالح اور نظام عدل کی جو تعلیم ہم نے اسے دی تھی، وہ اس نے تم کو بے کم وکاست پوری کی پوری پہنچا دی اور عملا اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا، اس کے بعد رسول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اٹھنا ہوگا اور یہ شہادت دینی ہوگی کہ رسول نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا، وہ تم نے انہیں پہنچانے میں، اور جو کچھ رسول نے تمہیں دکھایا تھا وہ تم نے انہیں دکھانے میں، اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی''۔ (۱۸)

مولانا سید سلمان حسینی اسی عبارت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''لیکن حق کی گواہی پہلے دنیا میں فرض کی گئی ہے، نبی اپنے مخاطبین کے سامنے حق کے گواہ ہیں، اور امت پوری انسانیت کے لیے حق کی گواہ ہے''(۱۹)۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''وسط لفظ ولد کی طرح مذکر اور مونث، واحد اور جمع سب کے لیے آتا ہے، اس کے معنی ہیں وہ شے جو دو طرفوں کے درمیان بالکل وسط میں ہو، یہیں سے اس کے اندر بہتر ہونے کا مفہوم پیدا ہو گیا اس لیے کہ جو شے دو کناروں کے درمیان ہوگی وہ نقطۂ توسط واعتدال پر ہوگی اور یہ اس کے بہتر ہونے کی ایک فطری دلیل ہے۔ امت مسلمہ کو امت وسط کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ امت ٹھیک ٹھیک دین کی اس بیچ شاہراہ پر قائم ہے جو اللہ تعالیٰ نے خلق کی رہنمائی کے لیے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے کھولی ہے اور جو ابتدا سے ہدایت کی اصلی شاہراہ ہے۔ یہود و نصاری اللہ کے نبیوں میں تفریق کر کے اس شاہراہ سے ہٹ گئے اور انھوں نے یہودیت و نصرانیت کی پگ ڈنڈیاں نکال لیں''۔(۲۰)

''دین کے معاملہ میں امت مسلمہ کی یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے قرآن میں دوسری جگہ اس امت کو خیر امت (بہترین امت) کہا گیا ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ جو چیز ٹھیک نقطۂ اعتدال و توسط پر ہوگی وہ لازماً بہترین بھی ہوگی۔ یہ امت چونکہ امتِ وسط ہے اس وجہ سے یہ خیر امت بھی ہے''۔(۲۱)

آیت کے اگلے ٹکڑے لتکونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا۔ میں امت وسط کے قیام کی ضرورت کا اعلان کیا گیا ہے، اور اس کو اس کے فریضۂ منصبی کی تلقین و یاددہانی کرائی گئی ہے، جس طرح حق کی گواہی رسولؐ کے ذمہ رکھی گئی تھی اسی طرح رسولؐ کے بعد یہ ذمہ داری امت کو دی گئی، اب یہ امت محمدیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر زمانے میں ہر قوم کے سامنے ہر زبان میں لوگوں کے سامنے اللہ کے دین کی گواہی دے، اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو لوگوں کی گمراہی میں وہ بھی برابر کی شریک سمجھی جائے گی چہ جائے کہ وہ خود گمراہی کے راستہ پر پڑ جائے اور دین حق کی گواہی کے بجائے اس میں کتر بیونت کا ارتکاب کرنے لگے۔

حضرت ابوسعید خدری کی روایت میں آنحضرت ﷺ نے وسط کی تفسیر عدل سے فرمائی ہے، جس کے معنی عمدہ اور بہترین کے ہوتے ہیں، وسط بمعنیٰ اوسط بھی استعمال ہوتا ہے جو خیر الامور اور افضل کو کہا جاتا ہے، قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی امت محمدیہ کو خیر امت اور افضل امت اس طرح قرار دیا گیا ہے۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْن (۲۲)(ترجمہ: ہم نے پیدا کیا ہے ان میں ایسے بہت سے لوگ ہیں، جو حق کے ذریعہ رہنمائی کرتے ہیں، اور حق کے ساتھ انصاف کرتے ہیں)

اور فرمایا: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۲۳)(ترجمہ: تم بہترین

امت ہو، تمام انسانوں کے لئے اس امت کو برپا کیا گیا ہے، تمہیں بھلائیوں کا حکم دینا ہے، برائیوں سے روکنا ہے، اور اللہ پر ایمان رکھنا ہے، اہل کتاب بھی ایمان لے آئیں، تو ان کے حق میں بہتر ہوگا، ان میں ایمان والے ہیں، لیکن ان کی اکثریت معصیت پیشہ ہے)۔

امت محمدیہ کو اس حیثیت سے ایک معتدل امت بنایا گیا ہے اور اس میں ہر قسم کا جسمانی اخلاقی، روحانی اعتدال رکھا گیا ہے، وہ نہ عقیدے میں دوسروں کی طرح افراط وتفریط کا شکار ہے اور نہ عبادت وعمل میں، اس کو معاشرت وتمدن اور اقتصاد میں بھی درمیانی راہ اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے جو اس کے کمال کی علامت ہے، پھر اسی نظام عدل کو پوری دنیا میں قائم کرنے کی اس کو ذمہ داری دی گئی ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

''اعتدال کے لفظی معنی برابر ہونا، یہ لفظ عدل سے مشتق ہے، اس کے معنی برابر کرنے کے بھی ہیں، وصف اعتدال کی یہ اہمیت کہ اس کو انسانی شرف وفضیلت کا معیار قرار دیا گیا.....اس بیان سے آپ نے یہ بھی معلوم کرلیا ہوگا کہ امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی جو فضیلت آیت مذکور میں بتلائی گئی، وکذلك جعلنٰكم امة وسطًا، یعنی ہم نے تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے، یہ بولنے اور لکھنے میں تو ایک لفظ ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے کسی قوم یا شخص میں جتنے کمالات اس دنیا میں ہو سکتے ہیں ان سب کے لئے حاوی اور جامع ہے۔ اس میں امتِ محمدیہ کو امت وسط یعنی معتدل امت فرما کر یہ بتلا دیا کہ انسان کا جوہرِ شرافت و فضیلت ان میں بدرجہ کمال موجود ہے، اور جس غرض کے لئے یہ آسمان وزمین کا سارا نظام ہے، اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، یہ امت اس میں ساری امتوں سے ممتاز اور افضل ہے.....اس میں امت محمدیہ کے اعتدالِ روحانی و اخلاقی کو واضح فرمایا ہے، کہ وہ اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات کو چھوڑ کر آسمانی ہدایت کے مطابق خود بھی چلتے ہیں، اور دوسروں کو بھی چلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کسی معاملہ میں نزاع واختلاف ہوجائے تو اس کا فیصلہ بھی اسی بے لاگ آسمانی قانون کے ذریعہ کرتے ہیں، جس میں کسی قوم یا شخص کے مفاد کا کوئی خطرہ نہیں''۔(۲۴)

دراصل یہ سارا ڈرامہ روح اسلام کو کمزور کرنے اور اس کی اس طاقت کو زیر کرنے کے لیے ہے جس کی ابتدا صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد مغرب نے کی تھی اور جس کے سبب استشراق کا سارا لٹریچر وجود میں آیا اور پھر خود مسلمانوں میں مستشرقین صفت لوگ پیدا ہوگئے، عہد حاضر میں امریکہ نے اپنے مخابراتی نظام کو اس کے لیے استعمال کیا، اس کے ذریعہ حکومتوں کا کنٹرول حاصل کیا گیا، اداروں کی سوچ بدلی گئی، علماء خریدے گئے، دانشوروں کی ٹیم تیار کی گئی، ان کے ذریعہ امریکی ''معتدل اسلام'' کی تشہیر کرائی گئی، اسلام سے مغرب کو جو خطرہ اور جو نفرت ہے وہ نئی نہیں خلافت عثمانیہ کے دور میں عثمانیوں نے جس طرح عیسائیوں کی مدد کی، ان کو عزت دی، مراعات عطا کیں اور خود عیسائی حکومتوں نے خلافت عثمانیہ کی اطاعت قبول کر کے یا اس کا حلیف بن کر جو سکون محسوس کیا وہ اپنی مثال آپ ہے، اس کے باوجود یورپ خلافت عثمانیہ کو کبھی برداشت نہیں کر سکا، اس کے خلاف ہمیشہ ریشہ دوانیاں اور ہرزہ سرائیاں جاری رہیں، اس کو ختم کرنے کے لئے آپس میں لڑنے والے سارے دشمن ایک

ہوگئے، بیسویں صدی کے ربع اول میں اس کے حصے بخرے کر دیے گئے، خلافت کو اس طرح ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا کہ پھر کبھی مسلمانوں میں اتحاد کی سبیل پیدا نہ ہو سکے، پٹرول کی دریافت کے بعد دولت کے پیش نظر آپس میں ان جاگیرداروں کو اس طرح باہم دست وگریباں کر دیا گیا کہ وہ کبھی بھی متحد ہو کر اس دولت کے اصل دشمن کے خلاف اس کے استعمال کا تصور بھی نہ کر سکیں، پٹرول پر ظاہری قبضہ تو ان ممالک کا تھا ہی، مگر اب قصہ کچھ اور ہوگا جبکہ اس اقدام کا اعلان کیا گیا ہے کہ اب معیشت کا انحصار پٹرول پر نہیں ہوگا، ظاہر ہے کہ اب دروازے چوپٹ کھلیں گے اور وہ سب کچھ ملک میں لایا جائے گا جس سے تہذیب اسلامی تباہ ہوگی مگر اسی کی تباہی پر معیشت کا انحصار ہوگا، اس طرح اسلامی نظام کی مکمل طور پر بیخ کنی کی گئی اور اس کی تکمیل اب مملکت توحید کے ذریعہ کی جارہی ہے، جس طرح وسطیت واعتدال کا نعرہ لگانے والے تیار کیے گئے اسی طرح جنگجو، متطرفین تیار کیے گئے، تشدد سے بھرپور، جذبات کو بھڑکانے والی ویڈیوز تیار کرنے والے ادارے تیار کیے گئے، چند سال قبل جب تیونس سے پھر انقلاب کی لہر اٹھی جو دیگر ممالک تک پہنچی اور جس کے پس پشت اقتدار اسلام پسندوں کے ہاتھ میں جاتا نظر آیا تو ظالموں نے اس کو اغوا کر لیا، پرامن انقلابی تحریکوں کی آڑ میں اپنے گماشتے اور ٹولے داخل کر دیے، قتل وغارت گری کی ایک نئی داستان رقم کی گئی اور دنیا کو یہ باور کرایا گیا کہ اسلام میں دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں، اسلام کا سیاسی نظام اس قابل نہیں کہ اسکو نافذ کیا جائے، جب بھی اس نظام کی بات کی جاتی ہے تو اسی طرح کے قتل وخون کی نوبت آتی ہے جس طرح ان ممالک میں اس وقت ہورہا ہے، اس پوری صورت حال کو اور ''متطرف اسلام'' و ''معتدل اسلام'' کو سید قطب رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے، انھوں نے بہت مختصر الفاظ میں امریکہ کی پسند وناپسند کو بیان کر دیا اور یہ واضح کر دیا ہے کہ امریکہ کے نزدیک تشدد، دہشت اور انتہا پسندی کا معیار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''امریکہ اور اس کے حلیف مشرق وسطیٰ میں جس اسلام کے نفاذ کے خواہاں ہیں اس اسلام میں وہ طاقت نہیں جو استعمار کا مقابلہ کر سکے، جو سرکشی کی سرکوبی کر سکے، امریکی ایڈیشن والے اس اسلام میں نواقض وضو کے متعلق تو فتوی معلوم کیا جائے گا، لیکن مسلمانوں کے سیاسی احوال، اقتصادی، اجتماعی اور مالی ضوابط سے متعلق اس اسلام میں فتوے کی کوئی گنجائش نہیں، یہ اسلام کے ساتھ ایک مذاق ہی نہیں ایک المیہ بھی ہے''۔(۲۵)

بعض رپورٹوں کے مطابق امریکہ نے اسلام کی صحیح تصویر کو مسخ کرنے کے لئے اور متطرف وغیر متطرف اسلام کی تعریف وتشریح کو عام کرنے کے لئے ملینوں ڈالر خرچ کیے ہیں، اب تو اس نے حضور ولی عہد کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں امریکہ کے ''معتدل اسلام'' کی تشریح بھی وہی کر رہے ہیں، اموال بھی فراہم کر رہے ہیں، ٹرمپ کو ملت کی طرف سے جزیہ بھی دے رہے ہیں اور اپنوں کو عدم اطاعت کے نتیجہ میں ظلم کا مزہ بھی چکھا رہے ہیں، حالیہ کارروائیوں سے ان کی خاندانی اور اندرونی کشمکش کا پردہ بھی فاش ہو گیا ہے، یہ واضح ہو گیا ہے کہ کچھ لوگ ان کے ''معتدل اسلام'' کے نفاذ کی راہ میں بہر حال رکاوٹ بن رہے ہیں، اگر چہ اصل مسئلہ اقتدار کا ہے، سننے اور بولنے میں یہ لفظ اور یہ اصطلاح بہت بھلی معلوم ہوتی ہے لیکن ذرا گہرائی سے دیکھیے تو یہ دین بیزار، دین کی تقسیم، دین کو چھوڑنے، من پسند دین کو تشکیل دینے اور اسلامی نظام سے دست بردار کرنے کے لئے

وضع کی گئی ایک پرفریب اصطلاح ہے، ذرا اور گہرائی میں جانے سے بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے ''الاسلام'' کے بالمقابل جتنے قسم کے بھی اسلام ہیں وہ امریکی فریب اور مغربی فلسفہ ہیں ان کا راست فکر اسلامی سے اسی طرح دور دور کا کوئی واسطہ نہیں جس طرح ناحق قتل وغارت گری اور بے جا تشدد کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ''اسلام'' کو نہ ''متطرف'' سے متصف کیا جاسکتا ہے نہ ''معتدل'' سے، وہ تو دین فطرت ہے، فطرت اور عدل وقسط کے عین مطابق اس کو انسانوں کے لئے نعمت ورحمت بنا کر اتارا گیا ہے، اس میں کسی طرح کا نقص نہیں رکھا گیا اور نہ اس کو کسی طرح کی اصلاح کی ضرورت ہے، ارشاد ربانی ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَمُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۶) (ترجمہ: آج میں نے تمہاری خاطر تمہارا دین مکمل کردیا ہے، اور اپنے انعامات (اپنا واضح قانون دے کر) تم پر تمام کردیے ہیں، اور اسلام کو بحیثیت دین پسند کرلیا ہے (پسند تو ازل سے تھا، اس کا آج آخری اظہار واعلان کیا جارہا ہے)۔

وہ ''الدین القیم'' ہے جس کا واضح مطلب ہے کہ اس میں کسی قسم کی کجی کوئی نقص اور کسی طرح کا ٹیڑھ پن نہیں ہے، اس کی شریعت نفاذ کے لئے آئی ہے، وہ عمل کے لئے دی گئی ہے، اس کے بارے میں مطالبہ ہے کہ اسی پر عمل کیا جائے، اس کے بالمقابل کسی کی خواہشات قابل عمل نہیں، ارشاد ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۷) (ترجمہ: پھر ہم نے آپ کو دین اور عبدیت کے نظام کو پورا ضابطہ اور قانون عطا کیا، آپ پر ذمہ داری ہے کہ اسی کی پیروی کریں، اور صحیح علم نہ رکھنے والوں کی خواہشات، رجحانات اور من مانی رایوں کو اختیار نہ کریں)۔

صرف اللہ کو رب مان لینا کافی نہیں بلکہ اس کو رب تسلیم کرکے اس پر جمنا ضروری ہے، فرمایا گیا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۲۸) (ترجمہ: جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، مالک وخالق اللہ ہے) اور پھر اس پر انہوں نے استقامت اختیار کی (حق پر مضبوطی سے جمے رہے) ان پر فرشتے نازل ہوں گے، جو ان سے کہیں گے کہ مت ڈرنا اور مت رنجیدہ ہونا، اور جنت کی خوشخبری قبول کرو، جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا تھا)۔

اس ''استقاموا'' کا مطلب بیان کرتے ہوئے امام ماوردی نے استقامت کے پانچ مناہج یا پانچ صورتیں نقل کی ہیں جو درحقیقت سبھی مطلوب ومقصود ہیں اور ان ہی سے الاسلام کا تصور مکمل ہوتا ہے، حضرت ابوبکرؓ اور امام مجاہد کے مطابق اس سے رب کی وحدانیت پر استقامت اختیار کرنا مراد ہے، ابن عباسؓ، حسن اور قتادہ کے نزدیک اللہ کی اطاعت اور فرائض کی ادائیگی پر جم جانا، ابوالعالیہ اور سدی کے مطابق دین خالص کو اختیار کرنے اور تا موت عمل کرنے پر جم جانا مراد ہے، جبکہ چوتھی شکل استقامت کی یہ ہے کہ وہ اپنے افعال میں بھی اسی استقامت کا مظاہرہ کرنے لگے جس استقامت کا اظہار اقوال میں کرتا ہے، پانچویں صورت یہ

ہے کہ جس طرح علانیہ استقامت کا اظہار کیا جائے اسی طرح خلوتوں میں بھی استقامت کو لازم پکڑا جائے،(۲۹) **سوال یہ ہے کہ جس ایمان پر استقامت کی تعلیم دی جارہی ہے اور جس استقامت کو یہاں مقام مدح میں ذکر کیا جارہا ہے اس سے اس ''معتدل اسلام'' کی فکر کہاں ظاہر ہورہی ہے جس کے ''حضور ولی عہد'' داعی ہیں۔**

جس دین پر استقامت کا حکم دیا گیا تھا اور جس کے متعلق یہاں تک فرمایا گیا تھا کہ اگر موسیٰؑ ہوتے تو وہ بھی میری اتباع کرتے اس میں حضور ولی عہد کے ''معتدل اسلام'' کی گنجائش کہاں، حضورﷺ کا یہ ارشاد گرامی دیکھیے:

عن جابر عن النبی حین آتاہ عمر فقال: انا نسمع احادیث من یھود تعجبنا افتری ان نکتب بعضھا؟ فقاال امتھوکون انتم کما تھوکت الیھود والنصاری؟ لقد جئتکم بھا بیضاء نقیة ولو کان موسی حیا ما وسعه الا اتباعی۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے رسول اللہﷺ نے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ایک مرتبہ رسول اللہﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم لوگ یہودیوں سے احادیث سنتے ہیں اور وہ ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ کیا آپﷺ ہمیں اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض کو لکھ لیا کریں۔ آپﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم بھی اس طرح حیران ہو جس طرح یہود و نصاری حیران ہیں اور تم اس بات کو اچھی طرح جان لو کہ میں تمہارے پاس صاف اور واضح شریعت اور دین لے کر آیا ہوں۔ اگر حضرت موسیٰؑ بھی زندہ ہوتے تو وہ بھی میری ہی اتباع اور پیروی کرتے۔(۳۰)

آج موسیٰ علیہ السلام کی طرف نسبت کرنے والے منحرف یہودیوں کے مشوروں پر مسلمان اور مسلمانوں کے ٹھیکیدار عمل پیرا ہیں، توحید اور قرآن وسنت کے نام پر عجیب مذاق کیا جارہا ہے، نہ قرآن کے فیصلے نافذ ہورہے ہیں، نہ قرآن کو حکم بنایا جارہا ہے، نہ قرآن کی معاشرت اختیار کی جارہی ہے، نہ حکومت کو قرآن وسنت کے تابع کیا جارہا ہے، بلکہ ان کے مشورے پر دامن بچانے کو ''معتدل اسلام'' کے نام سے پیش کیا جارہا ہے، جن یہودیوں کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں ''مملکت توحید کا شہزادہ'' لگا ہوا ہے ان ہی یہودیوں کو موضوع بنا کر قرآن مجید نے مسلمانوں کو انتہائی سخت الفاظ مین متنبہ کیا تھا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ. وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۳۱)(ترجمہ: ہم نے تورات اتاری تھی، اس میں ہدایت اور روشنی تھی، جو انبیاء اسلام کے علمبردار تھے، جو ربانی اور جید علماء تھے وہ اسی تورات کے حوالے سے ان یہودیوں کے مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے، کیوں کہ ان پر تورات کی حفاظت کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی، اور اس کے گواہ اور نگراں تھے، اس لئے ان لوگوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، مجھ سے ڈرو، اور میری آیتوں کا دنیا کی حقیر پونجی سے سودا مت کرو، اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون

کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے، وہ کافر ہیں۔ہم نے ان پر یہ قانون عاید کیا تھا کہ جان کا بدلہ جان ہے، آنکھ کا بدلہ آنکھ، اور ناک کا بدلہ ناک، اور کان کا بدلہ کان، اور دانت کا بدلہ دانت اور جو زخم بھی ہوں ان میں قانون قصاص (برابری اور مساوات کا) جاری کیا جائے، جو اپنے مطالبے کو چھوڑ دے اور اپنے حق کا صدقہ کردے تو اس کے لئے کفارہ سیئات ہوگا، اور جو لوگ بھی اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کریں گے (نظام حکمرانی اور نظام عدالت اس کے مطابق نہیں بنائیں گے) ظالم اور ناحق عمل کرنے والے ہوں گے۔انجیل والوں کو چاہیے کہ جو کچھ اللہ نے اس میں نازل فرمایا ہے اس کے مطابق فیصلہ کریں، اور جو لوگ نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ فاسق (معصیت پیشہ اور نافرمان) ہیں)۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

''تیسرا حکم ان آیات میں یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے احکام کے خلاف حکم دینا بعض صورتوں میں کفر ہے جبکہ اعتقاد میں بھی اس کو حق نہ جانتا ہو، اور بعض صورتوں میں ظلم وفسق ہے، جبکہ عقیدہ کی رو سے تو ان احکام کو حق مانتا ہے، مگر عملا اس کے خلاف کرتا ہے''۔(۳۲)

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:''شریعت الٰہی سے بڑھ کر عادلانہ حکیمانہ صحیح ومناسب قانون اور کون ہوسکتا ہے، لیکن اتنی موٹی سی بات بھی محسوس وہی کرتے ہیں جن کی عقلیں شرک والحاد کے زنگ سے صاف اور ایمان وایقان کی روشنی سے منور ہوتی ہیں۔بڑی حیرت اور بڑی عبرت کے قابل آج کی ان آزاد''مسلم'' قوموں کی حالت ہے، جو فرنگی قوموں کے اثر سے طلاق، خلع، تعدد ازواج، ترکہ وغیرہ معاملات وفقہیات کے متعدد شعبوں میں فرنگی قانون کو دھڑا دھڑ اپناتے چلے جاتے ہیں، اور جوش تقلید فرنگ میں ان شدید مفاسد کو بھی نظر کے سامنے نہیں لاتے جو ان بشری اور محدود دماغوں سے نکلے ہوئے قوانین کے نفاذ سے معاشرے میں پیدا ہوجانے لازمی ہیں، یورپ اور امریکہ کی صنفی انارکی اور خانگی ابتری کو دیکھ کر مسلمان بجائے اس کے کہ فرنگیت سے بچتے اور جھجکتے، الٹے خود اس کے خیر مقدم کے لیے بیتاب رہنے لگے ہیں، عدم توازن اور معاشرے میں اختلال وانتشار انسان کی خودساختہ شریعت پر چلنے کا وہ لازمی نتیجہ ہے جس سے مفر کی کوئی صورت ہی نہیں۔''(۳۳)

ان آیات قرآنیہ کے ان الفاظ اور اسلوب کو دیکھتے ہوئے جو شخص قانون الٰہی پر عقیدہ وایمان نہ رکھے، اس کو صحیح نہ سمجھے اور اس کو صحیح نہ سمجھتے ہوئے انسانی قوانین کو اس پر ترجیح دے اور انسانی قوانین کے مطابق فیصلے کرے، انسانی قوانین کے مطابق نظام چلائے تو اس کے کفر اور ظلم وفسق میں کوئی شک شبہ نہیں، البتہ جو اعتقاداً حکم الٰہی کو صحیح سمجھے مگر عملاً اس کے خلاف حکم دے تو یہ ظلم ہے اور چونکہ عملا وہ اپنے مالک حقیقی کی اطاعت سے انحراف کا مرتکب ہورہا ہے اس لیے فسق ہے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کفر اور ظلم و فسق کی یہ تعریفات کیسی سخت ہیں اور مسلم ممالک کس طرح گردن گردن ان میں ڈوبے ہوئے ہیں، آج مسلم ممالک میں جن کے احکام نافذ کیے جارہے ہیں، جن کو مسیحا سمجھا جارہا ہے جن سے دوستیاں رچائی جارہی ہیں، جن کو اپنی دولت، اپنی قسمت اور اپنے وجود کا مالک بنایا جارہا ہے، ان کے متعلق قرآن کا صریح حکم یہ تھا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ

فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ) (۳۴)(ترجمہ: اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو اپنا قابل اعتماد ساتھی اور دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے سے اصل تعلق رکھتے ہیں، تم میں سے جو ان سے (اپنے دین وعقیدہ کے خلاف) تعلق رکھے گا وہ انہیں میں شمار کیا جائے گا، اللہ ایسے غلط کاروں کو ہدایت نہیں دیتا)۔

جو لوگ بھی ان کے خاکوں میں رنگ بھر رہے ہیں اور ان کے منصوبوں پر عمل کر رہے ہیں انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید نے منافقین کا یہ کردار بھی بیان کیا ہے، اسرائیل وامریکہ کی منشا پر چلنا، اسلام کے حصے بخرے کرنا، اسلام کی صحیح ترجمانی سے انحراف کرنا اور ساری تگ ودو اس لئے ہونا کہ ہم چکر میں نہ پڑ جائیں اس لیے ان کے تلوے چاٹنا کہ ہم پر کوئی مصیبت نہ آ پڑے، ہماری عیش وعشرت نہ ختم ہو جائے، قرآن کی نظر میں یہ منافقانہ کردار ہے:

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ (۳۵)(ترجمہ: آپ دیکھیں گے کہ جن کے دل روگی ہیں (جو منافق ہیں، اور برائے نام ایمان رکھتے ہیں) وہ انھیں کے خاطر ساری دوڑ دھوپ کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہمیں یہ ڈر ہے کہ کہیں ہم زد میں نہ آ جائیں، تو قریب ہے کہ اللہ مسلمانوں کو فتح عطا فرمائیں، یا اپنی طرف سے کوئی بھی فیصلہ فرمائیں، تو اس وقت یہ لوگ اپنی رازدارانہ (اور سازشی) باتوں پر کفِ افسوس ملتے رہ جائیں گے)۔

عالم عربی کا منظر نامہ سامنے رکھیے اور ان مسلم ممالک پر نظر رکھیے جن کو موقع ملا تھا کہ وہ ''الاسلام'' کی ترجمانی ونمائندگی کرتے، وہ شریعت اسلامی کو نافذ کرتے اور اس کے عادلانہ اور فطری نظام کے مطابق ملک کا سیاسی، عدالتی اور تعلیمی ومعاشرتی نظام قائم کرتے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ وہ امریکہ کے ''معتدل اسلام'' کے نفاذ کی تگ ودو میں لگے ہوئے ہیں، ان کا عمل دیکھیے اور قرآن کریم کا یہ صریح اور واضح ترین حکم پڑھیے، یہ حکم شریعت کے تئیں منافقین کے رویہ کو سامنے رکھ کر بیان کیا گیا ہے بلکہ منافقانہ سوچ اور منافقانہ کردار پر تبصرہ کیا گیا ہے، گویا مومن سے اس کے خلاف توقع کی ہی نہیں جا سکتی، ارشاد الٰہی ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِىْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۳۶)(ترجمہ: تو آپ کے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہوں گے، جب تک اپنے تمام جھگڑوں میں آپ کو حکم اور قاضی نہ مان لیں، اور اس کے بعد آپ کے فیصلے کے سلسلہ میں آپ کے دلوں میں کوئی تنگی اور ناگواری محسوس نہ کریں، اور سرِ تسلیم خم نہ کر دیں)۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی شکل میں حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ ''الاسلام'' کو بھیجا، یہی سب سے بہتر، سب سے خوبصورت اور سب سے آخری طریقۂ ہدایت ہے جس کی اتباع کا حکم اس طرح دیا گیا،

وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۳۷)(ترجمہ: ان اچھی باتوں کی پیروی کرو، جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے اتاری گئی ہیں، قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آ جائے، اور تم کو (پہلے سے) احساس بھی نہ ہو سکے)۔

سطور بالا کی تفصیل سے قارئین پر یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ اس وقت ملت اسلامیہ کے دھڑکتے دل اور اس کے مرکز عقیدت کو کس رنگ میں رنگا جا رہا ہے، اس کی کمان کیسے لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی ہے، جنھوں نے قرآن وحدیث کو بھی اپنی حرص وہوا کا نشانہ بنانے کی ٹھان لی ہے، اس صورت حال میں علماء کرام کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ وہ کردار عزیمت کو اپنا شیوہ بنائیں، کلمہ حق کی تلقین کریں، اسلام کی صحیح تصویر پیش کریں، مغرب کی طرف سے اسلام پر کیے جانے والے مسلسل فکری حملوں کو ناکام کریں، سچی بات یہ ہے کہ کسی عالم شریعت کے لیے جائز ہی نہیں ہے کہ وہ خلاف شریعت عمل پر خاموشی اختیار کرے، اور ایسی صورت حال میں جبکہ دین کو مکمل طور پر مسخ کیا جا رہا ہو، ظلم اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہو، حکمت ومصلحت کے تمام حدود پار کر لیے گئے ہوں پھر بھی لوگ خاموش ہی رہیں تو یہ خاموشی پھر مجرمانہ عمل کہلانے کی مستحق ہوگی، ہمارے سامنے حضرت ابوبکرؓ کا آہنی عزم، تمام صحابہ کرام کی عزیمت، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد وغیرہم کے ولولہ انگیز اور ایمان افروز واقعات ہیں جو مہمیز کرنے کے لئے کافی ہیں، حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا انك لن تستطيع معي صبرا (کہف:٦٧) حضرت خضر کو معلوم تھا کہ انھیں جو تکوینی علم دیا گیا ہے، حضرت موسیٰ اس سے واقف نہیں اور بظاہر ان کے اقدامات موسیٰؑ کو خلاف شریعت معلوم ہوں گے، حضرت موسیٰ وقت کے نبی تھے، عالم شریعت تھے تو ظاہر ہے کہ وہ خاموش نہ رہ سکیں گے، ان کا فرض منصبی ان کو ٹوکنے اور استفسار کرنے پر مجبور کر دے گا، واقعہ یہ ہے کہ ایسا ہی ہوا، ہر بار حضرت موسیٰ بول پڑے، اس طرح انھوں نے یہ سبق سکھایا کہ کسی عالم کے لئے خلاف شریعت عمل پر سکوت درست نہیں، حضرت خضر نے ان کے صبر نہ کر پانے کی علت بیان کرتے ہوئے کہا وكيف تصبر على مالم تحط به خبرا (کہف:٦٨) لیکن یہاں ایسا نہیں ہے، اب تو لوگوں کے سامنے ساری باتیں کھل کر آ چکی ہیں، اب تو لوگ حالیہ واقعات وفرامین شاہی سے پس منظر اور پیش منظر سے خوب اچھی طرح واقف ہیں مگر پھر بھی خاموش ہیں، کیا تاریخ کبھی اس خاموشی کو معاف کر سکے گی، ضرورت ہے کہ شاہ کے ''معتدل اسلام'' اور دین بیزاری سے عبارت شاہی فرامین کے صدور کے خلاف ہندوستان کے علماء ایک کل جماعتی متحدہ محاذ بنا کر مضبوط ومدلل اور صریح موقف کا اعلان کریں اور ماضی کی طرح علماء عزیمت کی یاد تازہ کریں، خلافت عثمانیہ کے زوال، آل سعود کے عروج اور شریف مکہ وآل سعود کے مابین رنجشوں کے پیش نظر اکابر ہند نے جو قائدانہ ومصلحانہ رول ادا کیا تھا یا ادا کرنے کی کوشش کی تھی اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے آگے بڑھیں، حق کی حمایت کریں اور ایک بار پھر تاریخ رقم کر ڈالیں۔

مغربی اصطلاحات کے کھیل کو مرعوبیت اور دفاعی ذہنیت سے ناکام نہیں بنایا جا سکتا، بلکہ آگے بڑھ کر مغرب سے پوچھنا پڑھے گا اور اسی کی تاریخ وتہذیب سے اس کو اس کی سخت گیری، تشدد پسندی، ظالمانہ روش، گھٹیا درجہ کی استبدادی ذہنیت اور اس کی دہشت گردانہ کارروائیوں کی مثالیں اسے کثرت سے دکھانی پڑیں گی، معلوم نہیں ہمارے لوگ کس طرح مغرب کی چلائی گئی اصطلاحات کے دام فریب میں آجاتے ہیں اور پھر سارا زور اس کے دفاع میں لگاتے ہیں، امت کا سرمایہ اور امت کی قوت اسی تردید ودفاع کی مہم میں صرف ہو رہی ہے اصل عالمی اور ملی مسائل تو ٹھنڈے بستے میں پڑے ہیں، خدا جانے کب امت کو انھیں نمٹانے کی فرصت ملے، واقعہ یہ ہے جس کو سمجھنا ضروری ہے کہ تطرف اور وسطیت واعتدال کی اصطلاحات امریکی بالا دستی کو قائم

ودائم رکھنے کے لئے فروغ دی گئیں، مسلم دنیا کوان ہی اصطلاحات کے دام میں پھنسادیا گیا اوراس کی بالا دستی یقینی ہوگئی، متطرف اسلام کی نمائندگی بھی سعودی سلطنت کی بنیاد میں شامل ہے، جس کو بعد میں وہابی اسلام سے تعبیر کیا گیا، اب اقتدار کو باقی رکھنے اور مستحکم کرنے کے لئے ''معتدل اسلام'' کے فروغ کی ذمہ داری بھی مملکت توحید کو دی گئی، کٹھ پتلی کا کھیل جاری ہے، پردے کے پیچھے سے مسٹر ٹرمپ ڈور کھینچ رہے ہیں اور شاہ وشہزادے رقص کررہے ہیں، اس وقت غلبہ واقتدار کفر کا ہے اور امت مسلمہ کے رہبروں نے کفر کے ہاتھ پر اپنے ذاتی اقتدار کی خاطر بیعت کر لی ہے تو اس میں کسی کا کیا قصور، ڈاکٹر گستاولی بان نے صاف لفظوں میں لکھا ہے: ''تاریخ ہم پر یہی ثابت کرتی ہے کہ مسلمہ اصول یہی ہے کہ جس کے ہاتھ میں تلوار ہے اس کے ہاتھ میں حکومت ہے'' (۳۸)

اس وقت سعودیہ جس ماڈریٹ اسلام کی بات کررہا ہے وہ امریکی اسرائیلی اور سعودی واماراتی مثلث کا مجوزہ خاکہ ہے جس میں رنگ بھرنے کی مکمل ذمہ داری توحید کی ٹھیکیدار مملکت کو دی گئی ہے، یہ کھیل انتہائی خطرناک ہے، اس کے نتیجہ میں بیت المقدس کے بعد مکہ ومدینہ تک ناپاک قدموں کے پہنچنے کے قوی امکانات پیدا ہوگئے ہیں جبکہ جزیرۃ العرب کے حدود کو پہلے ہی سب کے عبادت خانوں کا گہوارہ بنادیا گیا ہے۔

مختصرا یہ سمجھنا چاہیے کہ اسلام نہ معتدل ہے نہ متشدد وہ صرف وہی دین فطرت ہے جس کو ''الاسلام'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، یہ وہ اسلام ہے جو خالص اللہ کی عبادت کرنے کا مطالبہ کرتا ہے، یہی دین حق ہے جس کی حقیقت وحقانیت کو آیات قرآنیہ میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے، یہ اسلام خدا تعالیٰ کی توحید کا درس دیتا ہے اور ہر جگہ اور ہر معاملہ میں خدا کی بالادستی اور اس کی وحدانیت کے اعلان کا اس طرح مشورہ دیتا ہے:

فَلَا تَخۡشَوُا النَّاسَ وَاخۡشَوۡنِ وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِىۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ‌ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡـكٰفِرُوۡنَ. (۳۹) (ترجمہ: اس لئے ان لوگوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، مجھ سے ڈرو، اور میری آیتوں کا دنیا کی حقیر پونجی سے سودا مت کرو، اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے، وہ کافر ہیں)۔

یہ اسلام مکمل خودسپردگی، مکمل اطاعت اور کامل اتباع کا مطالعہ کرتا ہے، یہ اسلام اقرار باللسان اور عمل بالارکان سے عبارت ہے، ارشاد الٰہی ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّلَا مُؤۡمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَمۡرًا اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهُمُ الۡخِيَرَةُ مِنۡ اَمۡرِهِمۡ ‌ؕ وَمَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيۡنًا (۴۰) (ترجمہ: کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو۔ جب اللہ اور اس کے رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کردیں۔ کوئی اختیار اپنی رائے اور اپنے فیصلہ کا باقی نہیں رہتا، اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمائی کرے گا، وہ کھلی گمراہی میں پڑے گا)۔

چنانچہ ''الاسلام'' کے علاوہ باقی جتنے بھی قسم کے اسلام ہیں جیسے ''حضور ولی عہد کا معتدل اسلام'' تو یہ اسلام کی مغربی تعبیر وتشریح یا اللہ کے دین کو مغربی افکار کے سانچے میں ڈھالنے کی ناپاک کوشش ہے جو محض بربادی کا ذریعہ اور دیوانے کا ایک خواب

ہے جس کی تعبیر ممکن ہی نہیں البتہ اس کے بالمقابل اللہ کا یہ دعویٰ ہے هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَلَوۡکَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡن (صف:۹) (ترجمہ: اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین برحق دے کر بھیجا ہی اسی لئے ہے کہ وہ انھیں اور ان کے دین کو تمام ادیان پر غالب فرمادے، چاہے مشرکوں کو کیسا ہی برا لگے)۔

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

حواشی:

نوٹ: مضمون میں وارد تمام آیات کا ترجمہ مولانا سید سلمان حسینی ندوی صاحب کے ترجمۂ قرآن ''آخری وحی، اردو ترجمانی کے جدید قالب میں'' سے لیا گیا ہے۔

۱۔ آل عمران:۱۹
۲۔ آل عمران:۸۵
۳۔ مائدہ:۱۵-۱۶
۴۔ مائدہ:۱۹
۵۔ یونس:۷۲
۶۔ بقرہ:۱۲۸
۷۔ آل عمران:۵۲
۸۔ انعام:۱۶۲،۱۶۳
۹۔ بقرہ:۲۰۸
۱۰۔ آل عمران:۲۰
۱۱۔ تدبر قرآن، ج۲ص۱۳۵
۱۲۔ انعام:۱۵۳
۱۳۔ مسند احمد ج۷، رقم ۴۱۴۲
۱۴۔ http://www.naqed.info/naqed/thought/54-q-q.html
۱۵۔ ایضاً
۱۶۔ ایضاً
۱۷۔ بقرہ:۱۴۳
۱۸۔ تفہیم القرآن۔ ج۱،ص۱۱۹
۱۹۔ انتخابات تفاسیر، ج۱،ص۲۳۶
۲۰۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، ج۱،ص۳۶۳
۲۱۔ تدبر قرآن، ج۱،ص۳۶۴
۲۲۔ اعراف:۱۸۱
۲۳، آل عمران:۱۱۰
۲۴۔ معارف القرآن، ج۱ص۲۴
۲۵۔ دراسات الاسلامیہ، سید قطب، ص۱۱۹
۲۶۔ مائدہ:۳
۲۷۔ جاثیہ:۱۸
۲۸۔ حم سجدہ:۳۰
۲۹۔ نضرۃ النعیم، ج۲،ص۳۰۴
۳۰۔ مظاہر حق، ج۱،ص۲۵۳
۳۱۔ مائدہ۔۴۴،۴۵،۴۷
۳۲۔ معارف القرآن، ج۳،ص۱۵۶
۳۳۔ انتخاب تفاسیر، ص۸۱۰
۳۴۔ مائدہ:۵۱
۳۵۔ مائدہ:۵۲
۳۶۔ نساء:۶۵
۳۷۔ زمر:۵۵
۳۸۔ تمدن عرب ص۱۹۰
۳۹۔ مائدہ:۴۴
۴۰۔ احزاب:۳۶

☆☆☆

انکار حدیث

موضوع حدیث اور اس کی علامات

تحریر: ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم

تلخیص وترجمانی: محمد فرید حبیب ندوی
12fareedamu@gmail.com

وضاعین نے جھوٹی احادیث گڑھ کر حدیث نبوی کو جس طرح مشکوک ومشتبہ اور ناقابل اعتبار بنانے کی کوشش کی تھی، محدثین کرام نے ان کی اس کوشش کو پوری طرح ناکام کر دیا، چنانچہ انھوں نے ایک طرف تو ایسی علامات بیان کیں جن سے موضوع حدیث کی پہچان چل جاتی ہے، دوسری طرف ایک ایک موضوع حدیث کی نشان دہی بھی کر دی، اس طرح یہ فتنہ پوری طرح ناکام ونامراد ہوا۔

یہ علامات دو طرح کی ہیں۔ کچھ کا تعلق سند سے ہوتا ہے اور کچھ کا متن سے۔

سند میں وضع کی علامات:

اہم علامتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ راوی کذب میں مشہور ہو، اور ایسی حدیث بیان کرے جسے کوئی دوسرا ثقہ راوی بیان نہ کرتا ہو۔ علماء حدیث نے اس طرح کے کذابین کے بارے میں ہر طرح کی تفصیلات مہیا کر دی ہیں، اور گن گن کر ایک ایک کی اس طرح نشاندہی کر دی ہے کہ ان میں سے ایک بھی شخص بچ نہیں سکا ہے۔

۲۔ واضع خود اس بات کا اعتراف کرے کہ اس نے احادیث وضع کی ہیں، جیسے نوح بن ابی مریم نے اعتراف کیا تھا کہ اس نے سورتوں کے فضائل کی حدیثیں وضع کی ہیں، اور اسی طرح عبدالکریم بن ابی عوجاء نے اقرار کیا تھا کہ اس نے چار ہزار حدیثیں گھڑی ہیں۔

۳۔ راوی ایسے شیخ سے روایت کرے جس سے اس کی ملاقات ثابت نہ ہو یا اس کی پیدائش ہی شیخ کی وفات کے بعد ہوئی ہو، یا وہ جس شہر میں اس سے سماع کرنے کا دعوی کرے، اس شہر میں کبھی گیا ہی نہ ہو، اس طرح کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

مامون بن احمد ہروی نے دعوی کیا کہ اس نے ہشام بن عمار سے سماع کیا ہے، حافظ ابن حبان نے اس سے پوچھا: تم شام کب گئے تھے؟ اس نے کہا: ۲۵۰ھ میں، ابن حبان نے فرمایا: ہشام کی وفات تو ۲۴۰ میں ہی ہو چکی تھی، پھر تم نے اس سے کیسے روایت کر لی؟

عبداللہ بن اسحاق کرمانی نے محمد بن ابی یعقوب سے روایت بیان کی تو اس سے کسی نے کہا کہ محمد بن ابی یعقوب تمہاری پیدائش سے نو سال قبل ہی فوت ہو گئے تھے۔

یہ بات از خود واضح ہے کہ اس کام کے لئے رواۃ کی تاریخ ولادت و وفات، ان کے سفر ورحلات اور شیوخ و اساتذہ سے واقفیت ناگزیر ہے، یہی وجہ ہے کہ تنقید حدیث کے لئے تاریخ اور علم طبقات کی بڑی ضرورت ہوتی ہے، سفیان ثوری کا جملہ ہے:

''جب لوگوں نے جھوٹ بولنا شروع کیا تو ہم نے تاریخ سے کام لیا''۔

۴۔ کبھی وضع کا پتہ راوی کی حالت اور اس کے نفسانی محرکات سے بھی ہو جاتا ہے، جیسے حاکم نے روایت کیا ہے کہ سیف بن عمر کہتے ہیں: ہم سعد بن ظریف کے پاس بیٹھے تھے کہ اس کا بیٹا مکتب سے روتا ہوا آیا، اس نے رونے کی وجہ پوچھی تو لڑکے نے کہا

کہ استاد نے مارا ہے، سعد نے کہا: آج میں انہیں ذلیل کر کے چھوڑوں گا، پھر اس نے یہ حدیث بیان کی: مجھے عکرمہ نے ابن عباسؓ کے واسطے سے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارے بچوں کے استاد تم میں سب سے برے ہیں، وہ یتیم پر بہت کم رحم کرنے والے اور مسکین پر بہت زیادہ سختی کرنے والے ہوتے ہیں''۔

اسی طرح محمد بن حجاج نخعی نے یہ حدیث وضع کی کہ ''ہریسہ کمر کو مضبوط کرتا ہے''، یہ حدیث اس نے اس لئے گھڑی کیوں کہ وہ خود ہریسہ بیچا کرتا تھا۔

متن میں وضع کی علامات:

اس کی بھی بہت سی علامتیں ہیں، جن میں سے کچھ اہم یہ ہیں:

۱۔ رکاکت لفظی: یعنی متن حدیث میں کوئی ایسا رکیک لفظ استعمال ہوا ہو جسے ایک عام فصیح و بلیغ شخص بھی استعمال نہ کرتا ہو، تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ وہ حدیث موضوع ہے، اس لئے کہ سید الفصحا ﷺ ایسا رکیک لفظ استعمال کر ہی نہیں سکتے، اور محدثین کرام کو حدیث میں ممارست کی وجہ سے ایک خاص ملکہ حاصل ہوجاتا ہے، جس کے ذریعے وہ پہچان لیتے ہیں کہ یہ لفظ نبی اکرم ﷺ کا ہو سکتا ہے یا نہیں، کما قال ابن دقیق العید۔

۲۔ فساد معنی:

- فساد معنی سے مراد یہ ہے کہ حدیث بدیہیات عقلیہ کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کا کوئی امکان نہ ہو، جیسے مندرجہ ذیل حدیث: ''حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی نے سات مرتبہ کعبۃ اللہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیم کے قریب دو رکعتیں ادا کیں''۔

- حِکَم و اخلاق کے قواعد عامہ کے مخالف ہو: جیسے: ''ترکوں کا ظلم اچھا اور عربوں کا عدل برا ہے''۔

- یا وہ حدیث شہوت و مفسدہ کی طرف دعوت دیتی ہو: جیسے ''خوبصورت چہرے کو دیکھنے سے نظر تیز ہوتی ہے''۔

- جو حدیث حس و مشاہدہ کے برعکس ہو جیسے: ''اس صدی کے بعد کوئی ایسا بچہ پیدا نہ ہوگا جو اللہ کو مطلوب ہو''۔

- طب کے متفق علیہ قواعد کے خلاف ہو: جیسے حدیث: ''بیگن ہر مرض کی دوا ہے''۔

- جو حدیث عام تکوینی نظام کے مخالف ہو، جیسے: عوج بن عنق کے بارے میں ایک موضوع حدیث۔

- جو حدیث لغو و سخیف زبان پر مشتمل ہو: جیسے: ''سفید مرغا میرا دوست اور میرے محبّ جبرئیل کا دوست ہے''۔

ابن جوزی فرماتے ہیں: کسی نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ جس حدیث کو دیکھو کہ وہ خلاف عقل ہے، اصول و نقول سے ٹکراتی ہے، تو جان لو کہ وہ موضوع ہے۔

۳۔ جو حدیث قرآنی نصوص کے خلاف ہو اور اس میں تاویل ممکن نہ ہو۔ جیسے یہ حدیث کہ ''ولد الزنا کی سات پشتوں تک کوئی بھی جنت میں نہ جائے گا''۔ یہ حدیث آیت قرآن "ولا تزر وازرۃ وزر اخری" کے خلاف ہے۔

- اسی طرح جو حدیث صریح سنت متواترہ سے ٹکراتی ہو: جیسے یہ حدیث: ''جب میری طرف سے تمہیں کوئی ایسی حدیث سنائی جائے جو حق کے موافق ہو، تو اسے قبول کرلو، خواہ میں نے وہ بیان کی ہو یا نہ کی ہو''۔ یہ اس متواتر حدیث کے خلاف ہے کہ ''جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے''۔

- یا وہ قرآن و سنت کے عام قواعد کے خلاف ہو، جیسے ''میں نے قسم کھائی ہے کہ جس کا نام محمد یا احمد ہوگا، اسے دوزخ میں داخل نہ کروں گا''۔ یہ اس عام قاعدے کے خلاف ہے کہ نجات کا دارومدار اعمال صالحہ پر ہے نہ کہ اسماء والقاب پر۔

- یا وہ حدیث اجماع کے خلاف ہو: جیسے ''جس نے جمعۃ الوداع میں چند فرض نمازوں کی قضا کر لی تو اس کی ستر سالہ قضا نمازوں کی تلافی ہوجائے گی''۔

یہ اس اجماعی مسئلے کے خلاف ہے کہ کوئی عبادت فوت شدہ

فرائض کی قائم مقام نہیں ہوسکتی۔

- وہ حدیث دور رسالت کے معروف تاریخی حقائق سے ٹکراتی ہو، جیسے یہ حدیث کہ ''نبی ﷺ نے اہل خیبر پر جزیہ مقرر کیا'' حالانکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس وقت تک جزیہ معروف نہ تھا، بلکہ آیت جزیہ اس کے بعد جنگ تبوک کے سال نازل ہوئی۔ اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ حمام میں گئے تھے، جبکہ یہ معلوم ہے کہ اس زمانہ میں حجاز میں حمام کا رواج نہ تھا۔

- وہ حدیث راوی کے مسلک کے موافق ہو۔ یعنی کوئی ایسا شخص جو اپنے مسلک میں بے حد متعصب ہو، ایسی روایت بیان کرے جس سے اس کے مسلک کی تائید ہوتی ہو، جیسے کوئی رافضی اہل بیت کے فضائل میں کوئی حدیث بیان کرے۔

- کسی ایسے مشہور واقعہ کو جسے بہت سے لوگوں کو بیان کرنا چاہیے، صرف لوگ روایت کریں۔ مثلاً کوئی واقعہ صحابہ کی ایک عظیم جماعت کے سامنے پیش آیا، لیکن اسے روایت کرنے والا صرف ایک راوی ہو، تو یہ اس کے موضوع ہونے کی دلیل ہے، اس لئے کہ اگر وہ واقعہ صحیح ہوتا، تو اتنی بڑی تعداد میں سے صرف ایک راوی اس کا تذکرہ نہ کرتا، بلکہ کئی لوگوں نے اسے بیان کیا ہوتا، اسی اصول کی وجہ سے محدثین نے غدیر خم والی حدیث کو موضوع قرار دیا ہے، جس میں رافضیوں کے بقول حضور ﷺ نے صحابہ کے عظیم مجمع کے سامنے حضرت علی کی خلافت و جانشینی کا اعلان کیا تھا۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ واقعہ صحیح الوقوع ہوتا تو اسے بہت سے صحابہ بیان کرتے، خاص کر اس موقع پر جب کہ خلافت کے مسئلہ میں اختلاف ہوا، اس کو ضرور بیان کیا جاتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نہ سقیفہ کے دن کوئی اسے بیان کرتا ہے، نہ حضرت عمرؓ کی شوری کے دن اور نہ حضرت عثمان کی شہادت کے دن۔

اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اسے بعد میں گھڑا گیا، ورنہ ایسے مواقع پر اسے بیان نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ بقول ابن حزم:

''اس روایت کو بیان کرنے والا صرف ایک مجہول راوی ہے، جس کی کنیت ابو حمراء ہے، لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ یہ ابو حمراء کس دنیا کا آدمی تھا''۔

- معمولی باتوں پر عظیم ثواب یا سخت وعید کا ذکر ہو۔ قصہ گو اور واعظ حضرات نے لوگوں کو عمل پر آمادہ کرنے کے لئے اس طرح کی حدیثیں زیادہ وضع کی تھیں، جیسے ایک روایت ہے کہ جس نے چاشت کی نماز کی اتنی اتنی رکعتیں پڑھیں، تو اسے ستر نبیوں کے برابر ثواب ملے گا''۔

یہ ان اہم قواعد کا ہلکا سا خاکہ تھا، جو محدثین نے حدیث کی چھان پھٹک کے لئے وضع کیے تھے، اس میں سب سے قابل غور بات یہ ہے کہ ان اصولوں کا دارومدار محض سند پر نہیں ہے، بلکہ متن پر بھی ہے، چنانچہ محدثین نے صرف یہ نہیں کیا کہ کسی حدیث کو صرف سند کے اصولوں پر جانچیں، بلکہ اس کے ساتھ انھوں نے (عقل و درایت کے اصولوں پر) متن کی بھی تحقیق کی، بلکہ اگر دیکھا جائے تو انھوں نے متن پر زیادہ زور دیا، یہی وجہ ہے کہ مذکورہ اصولوں میں سے سند کے متعلق چار اصول ہیں، جبکہ متن کے بارے میں سات۔

اس کے ساتھ ساتھ ان حضرات نے ذوق فنی سے بھی کام لیا، اس لئے کہ جب آدمی لگاتار کسی کام کو کرتا ہے تو اس کے بارے میں ایک خاص طرح کا تجربہ اور ذوق پیدا ہوجاتا ہے، چنانچہ محدثین کو بھی حدیث کا ایک خاص ذوق حاصل تھا، جس کی وجہ سے وہ کسی حدیث کے بارے میں سمجھ جایا کرتے تھے کہ یہ قول رسول ہوسکتا ہے یا نہیں۔

اس طرح محدثین کرام نے ان علامات اور اپنے ذوق فنی سے کام لے کر ایک ایک موضوع حدیث کو چھانٹ کر رکھ دیا، اور اس طرح ذخیرۂ احادیث پر جو گرد چڑھ گئی تھی، محدثین کی کوشش نے اسے بے غبار کردیا، فجزاہم اللہ احسن الجزاء

(السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی)

☆☆☆

❑ فقہی مقالات (پہلی قسط)

سرکاری اسکیموں سے استفادہ اور حکم شریعت

مولانا محمد قمر الزماں ندوی
maeducationalsociety@gmail.com

تمہید:

سود کی حرمت منصوص اور قطعی ہے، فروعی اور استنباطی نہیں ہے۔ ارشاد خداوندی ہے، "احل الله البيع وحرم الربا" اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام قرار دیا۔ قرآن وحدیث میں اس پر بے شمار وعیدیں آئی ہیں: حدیث شریف میں سود کے ایک درہم کو چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سخت بتلایا گیا ہے۔

سود خوری پر اتنی سخت وعید ہے کہ شرک وکفر کے علاوہ کسی بڑے گناہ پر بھی اتنی سخت وعید نہیں ملتی: يا ايها الذين آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقى من الربوا ان كنتم مومنين، فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من الله ورسوله (بقرہ: ۲۷۸-۲۷۹) (ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو۔ پھر اگر تم اس پر عمل نہ کروگے تو اشتہار سن لو جنگ اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے۔

اسلام میں سود خوروں کے جرم کو انتہائی شدید جرم سمجھا گیا ہے، اور اس بارے میں نہایت سخت اور قطعی احکام صادر ہوئے ہیں، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

يا ايها الذين آمنو لا تأكلوا الربوا أضعافا مضاعفة (آل عمران: ۱۳۰) (ترجمہ: اے ایمان والو! سود نہ کھاؤ کئی حصے زائد)۔

قیامت کے روز سود خوروں کے انجام کی قرآن مجید میں یوں تصویر کشی کی گئی ہے کہ جس طرح وہ دنیا میں مال کی محبت اور اس میں مسلسل اضافہ کرتے رہنے کی ہوس میں خبطی اور مدہوش ہوجاتے ہیں، اسی طرح آخرت کے روز بھی ان کی وہی کیفیت ہوگی کہ وہ آسیب زدہ خبطی کی طرح مجنونانہ حرکت کریں گے اور سب کے سامنے ان کی رسوائی ہوگی۔

الذين ياكلون الربوا لا يقومون إلا كما يقوم الذى يتخبطه الشيطان من المس (بقرہ: ۱۷۵) (ترجمہ: جو لوگ سود کھاتے ہیں نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان خبطی بنادے لپٹ کر۔)

حدیث شریف میں سود لینے یہاں تک کہ سودی دستاویز لکھنے اور اس پر گواہی دینے سے بھی سختی سے منع کیا گیا ہے اور ایسا کرنے والوں پر لعنت کی گئی ہے، "لعن رسول الله آكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء" (مسلم شریف) رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، اس کو لکھنے والے، اس کی گواہی دینے والے سب پر لعنت فرمائی اور فرمایا کہ سب برابر ہیں۔

جس جگہ سود اور زنا عام ہوجاتا ہے، وہاں کسی وقت بھی عذاب الٰہی نازل ہوسکتا ہے فرمان نبوی ہے: اذا ظهر الزنا والربا فى قرية أحلوا بانفسهم عذاب الله (مستدرک حاکم) جب کسی بستی میں زنا اور سود عام ہوجائے تو ان لوگوں نے عذاب الٰہی کو دعوت دے دی ہے۔

عہد نبوی اور دور صحابہؓ میں جن مسلمانوں کو خطاب فرما کر سود کو حرام قرار دیا گیا اور سخت وعیدیں سنائی گئیں ان کے مالی و معاشی حالات دورِ حاضر کے مسلمانوں کے مالی و اقتصادی حالات سے زیادہ خراب، خستہ اور دردانگیز تھے، وہ حضرات کفار کے قرضے میں دبے ہوئے تھے، کفار ان کا خون چوس رہے تھے، کئی کئی روز تک فاقہ کرتے، بھوک کی وجہ سے غش کھا کھا کر گر جاتے تھے، دو تین مہینے گھر میں آگ نہیں سلگتی تھی، کپڑا بھی پوری تن پوشی کے لیے موجود نہیں تھا، ان لوگوں کو گزر بسر کے لیے یہود کی مزدوری کرنی پڑتی تھی آنحضرت ﷺ کو ازواج مطہرات کے نفقہ کے لیے اپنی جہاد میں کام آنے والی زرہ یہودی کے پاس رہن رکھنے کی نوبت آئی۔ اسی حال میں آپ کا وصال ہوا، ان حالات کے باوجود ان حضرات کو کفار کے مال و دولت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کو بھی منع کیا گیا۔

ولا تمدن عينيك الى ما متعنا به ازواجا منهم زهرة الحيوة الدنيا لنفتنهم فيه، ورزق ربك خير وابقىٰ. حدیث شریف میں ہے کہ "إن الربوا وإن كثر، فان عاقتبه تصير إلى قلٍ. یعنی سود خواہ کتنا ہی زیادہ ہو اس کا نجام کار قلت ہے۔

سود کے نقصانات ومضرات:

سود کے بارے میں اسلام کے اتنے سخت احکام پڑھ کر ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ سود میں آخر وہ کون سی خرابیاں اور نقصانات ہیں جن کی وجہ سے اسلام کو اس کے انسداد اور خاتمہ کے لیے اتنے سخت احکامات دینا پڑے اور اس نے دیئے، سودی نظام کا گہرائی سے جائزہ لینے پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سود کے نقصانات بے شمار ہیں، اسلام نے اس پر جو سختیاں کی ہیں وہ بہت درست اور صحیح ہیں، اس سے روحانی اور اخلاقی امراض بھی پیدا ہوتے ہیں، اجتماعی خرابیاں بھی وجود میں آتی ہیں، اور معاشی استحصال بھی ہوتا ہے، اخلاقی نقصان تو یہ ہے کہ سود لینے سے انسان کے اندر حرص، طمع، زر پرستی، بخل، خودغرضی پھر بغض وکینہ جیسے اخلاقی امراض وعیوب پیدا ہوتے ہیں جو سماج ومعاشرہ کے لئے گویا مہلک امراض ہیں، انسان کے اندر مال و دولت کا لالچ آتا ہے، دولت کو اکٹھا کرنے اور اسے بڑھانے کی ہوس ابھرتی ہے، اجتماعی نقصان یہ ہے کہ جب معاشرہ کے افراد میں خودغرضی اور مطلب پرستی پیدا ہوجاتی ہے، آپس کی ہمدردی اور خیرخواہی ختم ہوجاتی ہے تو باہمی تعلقات برقرار نہیں رہ پاتے اور معاشرے میں تناؤ اور کشیدگی کا ماحول پیدا ہوجاتا ہے جو آگے چل کر نفرت انگیزی پھر معاشرہ کی خرابی کا سبب بنتا ہے۔ معاشی نقصان تو سب سے زیادہ ہے، سود کا تعلق معاشرہ کے ان معاملات سے ہے جن میں قرض لیا جاتا ہے۔ قرض کی بہت سی قسمیں ہیں ہم یہاں صرف بینک کے قرض سے متعلق ہی گفتگو کریں گے۔ اور اکیڈمی کی جانب سے اس سلسلے میں جو سوالات موصول ہوئے ہیں ان کا ترتیب وار جواب دیں گے۔

یہ حقیقت ہے کہ بینک جب کسی شخص کو قرض دیتا ہے تو اس کو اس شخص کے کاروبار کے مفاد اور اس کے نفع اور نقصان سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، اس کا سالانہ سود مقرر ہوتا ہے۔ کاروبار نفع بخش ہو یا نقصان دہ، اس کا رأس المال محفوظ رہے اور اسے سود ملتا رہے۔ ایک مسلمان کے لیے بینک سے بلا عذر شرعی قرض لینا اور بینک کو سود کی رقم ادا کرتے رہنا درست نہیں۔ البتہ اگر حکومت بینک کے ذریعہ طلباء اور معذور افراد کو امدادی رقوم اور اسکالرشپ بطور عنایت دیتی ہے اور کسی حصہ کی واپسی نہیں ہوتی تو اس رقم کو ایسے افراد کے لیے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اب ہم سرکاری اسکیموں سے استفادہ کے متعلق سوالات کے جوابات علی الترتیب پیش کررہے ہیں۔

وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جائے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑے:

بینک سے حاصل کردہ وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، یہ صورت جائز ہے۔ بینک سے ایسے قرضوں کے لینے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، یہ گویا حکومت کی طرف سے امداد واعانت ہے۔ کیوں کہ یہ شکل "كل قرض جر نفعا" کے ضمن میں نہیں آتی۔ سرکاری

بینک پر چونکہ تمام جمہور کا حق ہے اس لئے مسلمانوں کے لیے ان سرکاری بینکوں سے قرض حاصل کرنے کا حق ہوگا یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے امام کو بیت المال سے قرض دینے کا حق دیا ہے۔

دلائل: سود کا تحقق اس وقت ہوتا ہے جب کہ ایک طرف سے ایسا ''فضل'' ہو کہ دوسری طرف سے اس کا کوئی عوض نہ ہو۔ لہذا مذکورہ صورت سود میں داخل نہ ہوگی۔ (۲) یہ شکل "کل قرض جر نفعاً اور فضل خال عن العوض" وغیرہ کے ضمن میں داخل نہیں ہے کہ ربوا اور سود کی تعریف صادق آسکے۔ (۳) صاحب فتاویٰ رحیمیہ لکھتے ہیں جہاں تک ہمیں معلوم ہے، اس قسم کے پلان سے حکومت کا مقصد بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنا اور غریب رعایا کو فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کرنا ہے، اسی لیے حکومت کچھ رقم کی چھوٹ بھی دیتی ہے (جسے سبسڈی کہا جاتا ہے) اس قسم کے پلان سے حکومت کا مقصد سود خوری نہیں ہے، اس لئے اگر کوئی شخص حکومت سے اس اسکیم کے تحت قرض لے اور حکومت کی طرف سے اس پر کچھ رقم کی چھوٹ ملے اور بقیہ رقم حکومت مع سود وصول کرے، اگر وہ سود، چھوٹ میں ملی ہوئی رقم (یعنی سبسڈی) سے ادا ہو جاتا ہو، اپنے پاس سے زائد رقم نہ دینا پڑتی ہو تو اس تاویل سے کہ ''حکومت نے بطور تعاون جو رقم دی تھی اس شخص نے اسی تعاون والی رقم میں سے کچھ رقم واپس کر دی''، مذکورہ اسکیم کے تحت قرض لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر سود کی رقم چھوٹ میں ملی ہوئی رقم (یعنی سبسڈی) سے زیادہ دینی پڑے تو پھر یہ معاملہ سودی کہلائے گا اور جائز نہ ہوگا۔ (۴) اسلامی فقہ اکیڈمی نے سود سے متعلق مسائل کے سلسلے میں جو تجاویز پیش کی تھیں ان میں سے ایک تجویز یہ بھی ہے:

ہندوستان میں بعض سرکاری قرضے ایسے ہیں جن میں سرکار کی طرف سے چھوٹ (Subsidy) دی جاتی ہے اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے، اگر سود کے نام سے لی جانے والی یہ اضافی رقم چھوٹ (Subsidy) کے مساوی ہو یا اس سے کم ہو تو یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں ہے۔ (ماہنامہ الرشاد، جنوری ۱۹۹۰)

معافی والے قرضہ کی ایک صورت جس میں زائد رقم نہ واپس کرنا پڑے:

معافی والے قرضوں کی وہ شکل جس میں مقررہ مدت کے اندر قرض واپس نہ کرنے کی صورت میں پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ لیکن صرف اصل رقم ہی واپس کرنی ہوتی ہے، تو یہ صورت جائز ہے، لیکن اگر اس صورت میں لی ہوئی رقم سے زائد رقم واپس کرنا پڑے تو پھر یہ سود میں داخل ہوگی۔ اور اگر اس شخص نے مقررہ مدت کے اندر رقم جمع کر دی اور حکومت نے اس رقم میں سے کچھ حصہ معاف کر دیا تو یہ صورت بھی جائز ہے اور یہ سمجھا جائے گا یہ حکومت کی طرف سے مدد تعاون اور سبسڈی ہے، جمہوری ملکوں میں مسلمان اس طرح کی اسکیموں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مفتی احمد خانپوری ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں جس سے اس مسئلہ کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''سوال میں مذکورہ صورت شرعی طور پر سود کی تعریف میں نہیں آتی۔ مثلاً پروجیکٹ سے کسی نے چار ہزار روپئے کنواں بنوانے یا مکان بنوانے کے لیے نقد لئے، محکمہ پروجیکٹ نے اپنے قاعدے کے ماتحت ایک ہزار روپیے بالکل صاف معاف کر دیے اور فقط تین ہزار قائم رکھ کر دو سال کا موقع دیا، پھر دو سال کے بعد چھوٹی اور لمبی قسطیں ادائیگی کے لیے متعین کیں، اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کر کے وصول کیا، مگر کل وصولی چار ہزار سے زائد نہ ہوئی، تو اب قسطوں کے ساتھ جو زیادتی تھی وہ سود نہ ہوگی، اور معاملہ بھی جائز رہے گا، کیوں کہ مجموعی قرض چار ہزار تھا، چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا کہ "فضل خال عن العوض" یا "کل قرض جر نفعاً" وغیرہ کی تعریف صادق آسکے۔ (نظام الفتاویٰ ۱/۲۶۹) (بحوالہ محمود الفتاویٰ ۴/۵۰۲)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی نے سود سے متعلق مسائل کے سلسلے میں جو تجاویز اعظم گڑھ کے سیمینار میں پیش کی تھیں ان میں سے ایک تجویز یہ تھی کہ ہندوستان میں بعض سرکاری قرضے ایسے ہوتے ہیں جن میں سرکار کی طرف سے چھوٹ (Sbsidy) دی جاتی ہے اور سود کے

نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے، اگر سود کے نام سے لی جانے والی یہ اضافی رقم (Subsidy) چھوٹ کے مساوی ہو یا اس سے کم ہو تو اضافی رقم شرعاً سود نہیں ہے۔ (ماہنامہ الرشاد، جنوری ۱۹۹۰)۔

اگر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم ادا کرنی پڑے تو کیا حکم ہے؟

اگر مقررہ وقت کے بعد قرض ادا کرنے پر قرض لینے والے کو اصل رقم کی (کل رقم) واپسی کے ساتھ زائد رقم ادا کرنی پڑے، تو یہ صورت ناجائز ہے کیوں کہ رقم کے ساتھ جو زائد رقم ادا کرنی پڑی ہے وہ زائد رقم سود اور ربا ہے اور یہ صورت "کل قرض جر نفعا" میں داخل ہے۔ مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''لون کی واپس کی جانے والی کل مقدار اس کی ملنے والی مقدار کے برابر یا اس سے کم ہے تو اس کا لینا درست ہے، ورنہ سود ہے جو جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب''۔ (محمود الفتاویٰ، ج۴، ص۴۹۸)

البتہ بے روزگار اور مفلس ومحتاج مسلمان جن کے پاس روزگار کے لیے روپیے پیسے نہ ہوں اور اس سطح پر ہوں کہ خود اپنے پیشوں سے کوئی روزگار شروع نہیں کر سکتے ان کے لئے ایسے قرض حاصل کرنا جائز ہے۔ سود لینا اور دینا یقیناً دونوں ہی گناہ ہے، البتہ سرکار اور سرکاری ادارہ اور اشخاص اور پرائیویٹ ادارہ کے حکم میں ایک گونہ فرق ہے، جب ہم اس ملک کے شہری ہیں، تو جیسے حکومت دوسرے شہریوں کو روزگار کے لئے قرض فراہم کرتی ہے، ویسے ہی مسلمانوں کو بھی اس طرح کی سہولت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، اور ہمارا بحیثیت شہری اس پر حق ہے۔ لہذا جو مسلمان واقعی ان قرضوں اور اسکیموں کے محتاج ہیں ان کو اس طرح کے قرضوں اور اسکیموں سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا۔ البتہ خوش حال مسلمانوں کے لئے بلا ضرورت اس طرح کی اسکیموں سے فائدہ اٹھانا اور ایسے قرضے لینا جائز نہیں ہوگا۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ عام حالات میں محض معیار زندگی کی بلندی اور خوب سے خوب تر کی تلاش کے پیش نظر سودی قرض لینا جائز نہیں۔ علامہ ابن نجیم مدنیؒ نے لکھا ہے کہ حاجت مندوں کے لئے سودی قرض لینے کی گنجائش ہے۔ "ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباہ النظائر، ج۱، ص۲۹۴)

سروس چارج کے نام پر یا انتظامی خرچ کے نام پر زائد رقم لینا کیسا ہے؟

اگر بینک یا غیر سرکاری ادارے غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد کا مطالبہ کریں لیکن اس کی شرح بہت کم ہو جس کو بینک (یا اس طرح کے ادارے جو سودی قرض دیتے ہوں) سروس چارج کا نام دیتے ہوں یا اپنی مقدار کے اعتبار سے سروس چارج کہلا سکتا ہو تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم سود کے دائرے میں نہیں آئے گی، اس کو انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت وگنجائش دی جا سکتی ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''جیسا کہ معلوم ہوا ہے کہ ایسے ترقیاتی قرضوں میں اصل مقصود نفع کمانا نہیں ہوتا بلکہ عوام کے لیے بنیادی ضروریات اور روزگار کی فراہمی مقصود ہوتی ہے، اس لئے اگر اس پر لئے جانے اضافے کو دفتری اخراجات اور ضروریات پر محمول کیا جائے تو مناسب معلوم (محسوس) ہوتا ہے، جیسا کہ مولانا مفتی نظام الدین صاحبؒ کا رجحان ہے۔ آگے مزید لکھتے ہیں: ''تاہم اس پر پورا اطمینان نہیں ہوتا کہ سودی قرضوں پر وصول کی جانے والی شرح قرض کی مقدار کے لحاظ سے اور اسی تناسب سے کم وبیش ہوتی ہے۔ اگر یہ دفتری اجرت ہوتی تو ضرور تھا کہ فرق پایا جاتا، کیوں کہ رقم پچاس ہزار ہو، یا پانچ ہزار، دفتری کارروائی میں وقت اور محنت یکساں لگتی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کو رشوت والے مسئلہ پر ایک درجہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ رشوت دینے والا بھی اپنے حق جائز کو حاصل کرنے کے لیے رشوت دیتا ہے اور سودی قرض لینے والا بھی سرکاری خزانوں پر اپنے حق قرض کی وصولی کے لیے سود دینے پر مجبور ہے۔ تاہم چونکہ ان دونوں حقوق میں بہت تفاوت ہے اس لئے کہ حکومت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ مرفہ الحال لوگوں کو مزید معاشی خوش حالی کے لیے قرض دیتی چلی

جائے، اس لئے قرض کو بھی ایسی صورت کے ساتھ مشروط رکھا جانا چاہیے کہ کاروبار کا بقا اور تحفظ اس کے بغیر دشوار ہو جائے۔'' (جدید فقہی مسائل ج ۴، ص ۸۹)۔

مولانا مجاہد الاسلام القاسمیؒ قرض دینے والے مالیاتی ادارے (جو سروس چارج کے نام پر اور انتظامی اخراجات کے نام پر کچھ زائد روپے قرض خواہوں سے وصول کرتے ہیں) کے بارے میں اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''البتہ اگر سروس چارج سے مراد وہ واقعی عادلانہ اخراجات ہیں جو اس نظام کو چلانے پر خرچ ہوتے ہیں جیسے انتظامی اخراجات (Managemtn expenses of outlays) تو اس پر غور کیا جانا چاہیے کہ قرض خواہ جو اس نظام سے فائدہ اٹھا رہے ہیں کیوں نہ وہی اس پر آنے والے خرچ کے ذمہ دار قرار دیئے جائیں۔ ٹھیک جس طرح ایک قرض خواہ جو اپنے دوست سے کوئی قرض حاصل کرتا ہے تو درمیانی قاصد کے آنے جانے کے اخراجات اور بذریعہ منی آرڈر قرض کی واپسی کے اخراجات اس کو ادا کرنے پڑتے ہیں، اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا، اور ظاہر ہے کہ جب حقیقی اخراجات ہی قرض خواہوں سے وصول کئے جائیں گے تو یہاں کوئی ایسی اضافی آمدنی حاصل نہ ہوگی جس سے اصحابِ سرمایہ سوسائٹیز کے لئے آمدنی ذریعہ تمول بنے۔ البتہ صرف ایک خطرہ رہ جاتا ہے کہ سوسائٹیز قائم کرنے والے افراد اگر خوف خدا سے خالی دل رکھتے ہوں، تو ضروری اخراجات کی مد کو پھیلا کر وہ اپنے تعیش اور تمول کا راستہ نکالیں گے، لیکن اس طرح کے مالیاتی اداروں کا کوئی ایسا وفاقی بورڈ موجود ہو جو عادلانہ اخراجات کا تعین وقتاً فوقتاً کرتا رہے، تو اس شرعی گنجائش سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا سدِ باب کیا جاسکتا ہے'' (مباحث فقہیہ ص ۴۲۲، از قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ)۔

سروس چارج کے نام پر اوسط سے زیادہ رقم اگر بینک لے تو کیا حکم ہوگا؟

اگر حکومت اور سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی رقم جو حکومت سروس چارج کے نام پر لیتی ہے وہ اوسط سے زیادہ ہو اور اس کو انتظامی خرچ پر محمول نہ کیا جاسکے تو یقیناً یہ فقہی ضابطہ "کل قرض جر نفعا" کے تحت سود ہوگا اور سوائے محتاج، ضرورت منداور پریشان حال مسلمانوں کے اور کسی دوسرے شخص کے لیے اس کی اجازت نہیں ہوگی، جو مالی اعتبار سے خوش الحال اور فارغ البال ہو، محض معیار زندگی کو بڑھانے اور عیش وعشرت نیز دوسرے کی ریس اور مقابلہ میں اس کے لئے اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا۔

چونکہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی کی ضروریات اور کاروبار کے لیے بھی ہوتے ہیں اس لئے ایسے اشخاص جو محتاج اور ضرورت مند ہیں اور بغیر اسکیم لئے اور اس سے فائدہ اٹھائے ان کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی اور سود پر قرض لیے بغیر کوئی چارہ کار بھی نہیں ہے تو اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہوگی لیکن چاہیے کہ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ضرورت و حاجت کی شدت کا معیار ہر شخص کی قوت برداشت وغیرہ کے اعتبار سے مختلف ہوگا اور فیصلہ کن عنصر ''رائے مبتلیٰ بہ'' ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی ایک استفتاء کے جواب میں تحریر ماتے ہیں:

''پس میرے نزدیک سرکاری خزانہ ایک ایسی دولت ہے جس سے انتفاع کا حق عام ہندوستانی شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حاصل ہے، اس لئے ترقیاتی اسکیموں، مکانات کی تعمیر، تجارت کی ترقی اور صنعت وحرفت کی ہمت افزائی، نیز بیکاروں کو باکار بنانے کے لئے جس قدر رقم بھی حکومت اپنے بجٹ میں رکھتی ہے ان میں ایک مسلمان شہری کا بھی اسی طرح حق ہے جس طرح دوسروں کا، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مسلمان اپنے اس حق کی تحصیل کے لیے جب آگے آنا چاہتا ہے تو حکومت جس نے اپنے مالیاتی نظام کی بنیاد سود پر رکھی ہے (اور فی الحال اکثریت کے فقدان کی وجہ سے ہم اس کی تبدیلی پر قادر بھی نہیں اگر

چہ اس نظام کی تبدیلی کی خواہش اور اس کے لیے ممکن حد تک عملی جدو جہد ہر مسلمان کا بہر حال فرض ہے کہ "من رای منکم منکرا فلغیرہ بیدہ، وان لم یستطع فبلسانہ، وان لم یستطع فبقلبہ" (متفق علی) اس کا یہ فیصلہ مسلمانوں کے لیے آڑے آتا ہے پس ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اپنے جائز حق کی تحصیل کے لیے بدرجہ مجبوری سود دینا اور سود دے کر اپنے حق کا حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ میرے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں ہے اور یہ کہنا درست ہے کہ اپنے جائز حق کی تحصیل کے لیے مسلمانوں کو رخصت حاصل ہے کہ وہ بدرجہ مجبوری سود دے کر اپنا حق حاصل کریں"۔ (مباحث فقہیہ ص ۴۶۸)۔

ان تفصیلات کی روشنی میں میرے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں ہے وہ یہ کہ مجبور اور محتاج مسلمان تجارت اور بزنس میں اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے سروس چارج دے کر اس اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور بدرجہ مجبوری سود دے کر اپنا حق حاصل کر سکتا ہے۔

اور شریعت میں اس کی نظیر موجود ہے۔ اسلئے کہ شریعت کا عام قاعدہ اور اصول تو یہ ہے کہ "ما حرم اخذہ حرم اعطاء ہ" اس اصول کے تحت علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہے، لیکن ایسی صورت میں جب کہ جائز حق کا حصول رشوت دیئے بغیر ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں رشوت دینا جائز ہے۔

صاحب الاشباہ علامہ ابن نجیم چودہویں قاعدہ "ما حرم اخذہ حرم اعطاء ہ" کے ذیل میں "الرشوۃ لخوف علی مالہ أو نفسہ" کا استثناء کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" الا فی مسائل الرشوۃ لخوف علی مالہ أو نفسہ (قولہ الرشوۃ لخوف علی مالہ) ھذا فی جانب الدافع، اما فی جانب المدفوع لہ فحرام ولم ینبہ علیہ، وینبغی أن یستثنی الأخذ بالربا للمحتاج فانہ لا یحرم کما صرح بہ فی البحر، ویحرم علی الدافع الاعطاء بالربا" (حموی، ص ۱۷۶ بحوالہ مباحث فقہیہ ص ۴۶۸)

"مگر مال یا جان کے خوف سے رشوت دینے کے مسائل میں، یہ جواز دینے والے کے حق میں ہے، اس شخص کے حق میں جس کو دیا گیا ہے حرام ہے، اسی طرح مناسب ہے کہ اس سے یہ صورت بھی مستثنیٰ ہو کہ کوئی محتاج شخص سود پر قرض حاصل کرے کہ یہ بھی حرام نہیں ہے، جیسا کہ البحر الرائق میں تصریح کر دی گئی ہے، لیکن قرض دینے والے کے لیے سود کی شرط پر قرض دینا حرام ہوگا"۔

حکومت کا عوام الناس کی اعانت کا شرعی حکم:

اگر حکومتِ وقت بعض ضروریات کے لیے عوام الناس اور رعایا کی مکمل امداد و اعانت کرے مثلاً مکان، بیت الخلاء وغیرہ کی تعمیر کرائے یا تعلیمی ضروریات کے لیے (رقم) اور اس کے لیے مخصوص شرائط و حدود ہوں کہ کس معیار کے لوگ اس اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ان رقوم میں سے کسی حصے کی واپسی بھی نہ ہوتی ہو اور یہ حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہو تو ایسی اسکیم سے مسلمان بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن ان شرائط اور معیارات کا خیال رکھنا ضروری ہوگا جو حکومت نے بنائے ہیں۔ ایک مسلمان کے لیے اس کی خلاف ورزی درست نہیں ہے۔

مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"صورت مسئولہ میں سرکار کی طرف سے جو رقم ملتی ہے وہ سرکاری امداد ہے وہ لی جا سکتی ہے۔ جس کو ضرورت نہ ہو وہ حاجت مند کو دے دے۔ اسی طرح مسجد و مدرسہ کی تعمیر میں لینا درست ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ بطور قرض رقم لے کر مسجد و مدرسہ میں خرچ کریں۔ اور سرکاری امدادی رقم سے قرض ادا کر دیا جائے۔ (فتاویٰ رحیمیہ جلد دہم، ص ۲۳۴ مطبوعہ جدید)۔

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی تحریر فرماتے ہیں:

پس میرے نزدیک سرکاری خزانہ ایک ایسی دولت ہے، جس سے انتفاع کا حق عام ہندوستانی شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی

ہے، اس لئے ترقیاتی اسکیموں، مکانات کی تعمیر تجارت کی ترقی اور صنعت وحرفت کی ہمت افزائی نیز بیکاروں کو باکار بنانے کے لئے جس قدر رقم بھی حکومت اپنے بجٹ میں رکھتی ہے ان میں ایک مسلمان شہری کا بھی اسی طرح حق ہے، جس طرح دوسروں کا، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ (مباحث فقہیہ، ۴۶۷)۔

مفتی عبدالرحیم صاحب لاج پوری ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''جب کہ حکومت بلا طلب بطور امداد اور غم خواری کے رقم دیتی ہے تو لینے میں مضائقہ نہیں، خود استعمال کرے یا حاجت مندوں کو دے دے''۔ (فتاویٰ رحیمیہ ج ۱۰، ص ۲۲۵، جدید ایڈیشن)

واسطہ بننے والوں کے لیے محنتانہ کا حکم:

گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقم کے حصول میں چونکہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور خرچ بھی ہوتا ہے اس رقم کو حاصل کرنے کے لیے کچھ لوگوں کو واسطہ بننا پڑتا ہے، واسطہ بننے والے اپنا مطلوبہ محنتانہ لیتے ہیں اور اسکیم سے فائدہ اٹھانے والے چونکہ ان کے محتاج ہوتے ہیں اس لئے ان کو مطلوبہ محنتانہ دیتے بھی ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ واسطہ بننے والے اپنے اوقات کو صرف کرتے ہیں اور کاغذی کاروائی کرتے ہیں اس لئے میری نظر میں چونکہ واسطہ بننے والوں کی حیثیت دلال کی ہے اور دلالی کی اجرت جائز ہے لہذا صورت مسئلہ میں واسطہ بننے والوں کا اپنا مطلوبہ محنتانہ لینا جائز ہے۔

جن صورتوں میں حکومت عوام الناس کی مدد کرتی ہے اور ان رقوم میں سے کسی حصہ کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے ان صورتوں میں تو واسطہ بننے والوں کا مطلوبہ محنتانہ لینا جائز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جن صورتوں میں حکومت عوام الناس کو سودی قرض دیتی ہے اور پورا معاملہ سودی ہوتا ہے ان صورتوں میں واسطہ بننے والوں کا مطلوبہ محنتانہ لینا درست معمول نہیں ہوتا کیوں کہ حدیث شریف میں ہے لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء (مسلم شریف)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

جیسے سود پر قرض لینا دینا حرام ہے اسی طرح سودی قرض کے لین دین میں واسطہ اور معاون بننا بھی جائز نہیں، ظاہر ہے کہ قرض دلانے کے لیے جو شخص واسطہ بن رہا ہے، وہ ایک سودی کاروبار میں معاون بن رہا ہے، اور گو اس کو کمیشن یا اجرت اصل رقم میں سے ملے، لیکن بہر حال یہ اس تعاون ہی کا اجر وصلہ ہے، لہذا اس معاملہ میں معاون بننا اور اس کی اجرت لینا درست نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (کتاب الفتاویٰ جلد ۵، ص ۳۷۰)۔

البتہ فی نفسہ واسطہ بن کر محنتانہ لینا غیر سودی شکل میں درست ہے، بشرطیکہ وہ اپنی محنت اور کام کے موافق لے البتہ اجرت اور محنتانہ پہلے طے کرلے تاکہ بعد میں نزاع نہ ہو، معاملہ مبہم نہ رہنا چاہیے۔

قال فی التار تا خانیہ وفی الدلال والسمسار یجب اجر المثل وما توافقوا علیه ان فی کل عشرة دنانیر کذا فذلك حرام علیهم وفی الحاوی سئل محمد بن سلمة عن اجرة السمسار فقال ارجو انه لا باس به وان کان فی الأصل فاسدا لکثرة التعامل وکثیر من هذا غیر جائز فجوزوا لحاجة الناس الیه الخ" (شامی ۵۳ ج ۵، کتاب الاجارۃ قبل فصل فی ضمان الأجیر)

الغرض واسطہ بننے والا چونکہ سودی لین دین میں معاون بن رہا ہے، اور قرآن مجید اس طرح کے تعاون سے منع کرتا ہے ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان اس لئے واسطہ بن کر محنتانہ لینا درست اور جائز نہیں ہوگا۔

☆☆☆

تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

دو یا دو سے زیادہ زبانیں سکھائیے :۔ بعض والدین اور خاص طور پر وہ لوگ جنھیں اپنا وطن چھوڑ کر اجنبی مقامات میں قیام کرنا پڑتا ہے یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر گھر میں دو زبانیں بولنے کا ماحول ہے تو کیا اس سے بچے کی نشو ونما متاثر ہوگی، کی اہل خانہ کو ایک ہی زبان پر اکتفا کرنا چاہئے، حتی کہ بچہ اس کو اچھی طرح سیکھ جائے، پھر اس کو دوسری زبان سیکھنے کا موقع دیا جائے، یا پھر اس کو ایک ساتھ دونوں زبانیں سیکھنے دی جائیں؟ یا اس طرح کا ماحول بنایا جائے کہ ایک زبان کو اصلی قرار دے کر برتا جائے جبکہ دوسری کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے؟ کیا کسی ایک زبان پر توجہ مرکوز نہ کرنے کے سبب اس کی لغوی استعداد، ذہانت اور قوت تفکیر کی نشونما تو متاثر نہیں ہوگی؟ اس کے سبب کہیں وہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار تو نہیں ہوگا؟

بلاشبہ ایسے گھروں کے بعض بچوں کی نشونما متاثر ہوتی ہے، جن میں دو زبانیں بولی جاتی ہیں، لیکن اس کے بالمقابل اس ماحول سے بہت سے مثبت فوائد حاصل ہوتے ہیں، اس ماحول میں اصل مسئلہ دو زبانوں کے استعمال کا نہیں ہے، بلکہ اہم بات یہ ہے کہ والدین گھر میں دونوں زبانوں کو بچے کے سامنے پیش کیسے کرتے ہیں، دونوں زبانوں کے ساتھ ان کا رویہ کیسا رہتا ہے، میں ایسے ماحول سے استفادہ کرنے کی کچھ تدبیریں یہاں ذکر کرتا ہوں۔

۱۔ پہلے پہل بچہ کی توجہ ایک جانب مبذول کرائیے، مثلا ہمارے ماحول میں پہلے اس کو اردو سکھائی جائے، پھر جو گھر سے باہر کی زبان ہو اس پر توجہ دی جائے، بچے کو اپنی زندگی میں جن کلمات کی ضرورت ہوتی ہے اس کی دو فہرست دینا اس کو انتشار ذہنی کا شکار کر دے گا، اس کے برعکس بچے کو پہلے مادری زبان سکھائی جائے تو اس کا نطق و تلفظ بھی بہتر ہوگا اور دوسری زبان بھی وہ جلدی سیکھے گا۔

اب اگر ایسا بچہ جس کی زبان اردو ہو وہ اپنے والدین کے ساتھ کسی اجنبی مقام پر رہے گا تو ظاہر ہے کہ وہ گھر کے باہر اپنی ضروریات اور زبان کے بارے میں غور کرے گا، چنانچہ اس کو گھر میں تو مادری زبان کی تعلیم دیجئے، جبکہ اجنبی زبان وہ ماحول سے خود بخود سیکھ لے گا۔

۲۔ اگر اس کو مادری زبان اول کے طور پر سکھائی جائے گی تو اس سے اس کے سامنے دوسری زبان کو سیکھنے اور سننے کا دروازہ کھلے گا، اگر وہ زبان گھر میں نہ بھی بولی جائے تو بھی ریڈیو، ٹی وی اور لوگوں کی گفتگو سے اس کو سنے گا اور سیکھے گا، اس میں کوئی شک نہیں کہ گھر میں مادری زبان کے استعمال کو ہی ترجیح دینا افضل ہے، لیکن اس کے ساتھ بچہ جب دوسروں کو اپنے لیے اجنبی زبان استعمال کرتے دیکھے گا تو وہ سمجھ لے گا کہ لوگوں کو مخاطب کرنے کا دوسرا طریقہ بھی ہے جیسے کہ وہ گھر میں اپنے والدین کو مخاطب کرتا ہے، چنانچہ وہ بغیر کسی اشکال کے طبعی طور پر اس زبان کو سیکھ لے گا۔

۳۔ جب بچہ اپنی مادری زبان (Mother Tongue) یا پہلی زبان (First language) میں مہارت حاصل کر لے اور اس کے مفردات کا ذخیرہ اس کے پاس محفوظ ہو جائے، اس کی ترکیبات وتعبیرات کو سمجھنے لگے تو پھر اجنبی زبان محض اس کے سامنے

پیش کرنے سے وہ سیکھنے لگے گا، اور جب وہ دونوں زبانوں کا استعمال شروع کر دے، تو پھر اہل خانہ کو چاہئے کہ اس سے دونوں زبانوں میں گفتگو کریں اور اس کے سامنے دونوں زبانوں کی چیزیں پڑھیں، ظاہر ہے کہ یہ طریقہ کار اہل خانہ سے زیادہ وقت کا طالب ہے۔

دوسرے مرحلے میں بچوں کے سامنے دونوں زبانوں میں تقابل کی کوشش کی جاسکتی ہے، بایں طور کہ بچے سامنے اس کی زبان اول کی ایک عبارت پیش کی جائے اور اس کی تشریح کی جائے، پھر انھیں بتایا جائے کہ اسی بات کو دوسری زبان میں کیسے ادا کیا جاسکتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بچے کو اپنی مادری زبان کی ضرورت ہے جو اس کی قومی زبان ہے اور جس زبان میں اس کا تہذیبی و مذہبی سرمایہ موجود ہے، لیکن اگر وہ اپنے والدین کے ساتھ اجنبی مقام پر طویل مدت کے لیے قیام پذیر ہے تو اسے وہاں کی زبان کی بھی ضرورت ہے۔

۴۔ بچے پر جبر کہ وہ ایک ہی زبان استعمال کرے دوسری نہ کرے کبھی بھی فائدہ مند نہیں ہوتا، زبان اظہار خیال اور شخصیت کی تعمیر کا بہترین ذریعہ ہے، بچے کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعبیر کی آزادی محسوس کرے، اپنے من کی بات اپنے اختیار کردہ کلمات کے ذریعہ کرے جو کہ اس کی شخصیت اور اس کے موقف کے موافق ہوں، کبھی ایسا بھی ہوگا کہ آپ اس سے ایک زبان میں گفتگو کریں گے اور وہ آپ کو دوسری زبان میں جواب دے گا، اس میں کوئی مشکل نہیں ہے، اگر چہ یہ فطری بات ہے کہ آپ کی خواہش ہوگی کہ بچہ گھر کے اندر اپنی مادری زبان پر توجہ دے جبکہ گھر سے باہر وہ بقدر ضرورت دوسری زبان استعمال کرے، لیکن بچے کو یہ احساس دلانے میں کوئی فائدہ نہیں ہے کہ اجنبی زبان کا استعمال باعث شرمندگی اور گراں بار ہوتا ہے، یہ نکتہ سمجھنا چاہئے کہ جب ہم اس پر اپنی زبان اول کا ایسے وقت میں استعمال لازمی قرار دیتے ہیں جس وقت وہ اس سے دور بھاگ رہا ہو تو ہم زبان اول سے بھی اس کی دوری کا سبب بن رہے ہوتے ہیں۔

۵۔ اگر بچہ عربی ہے تو اس کی اصلی زبان عربی ہوگی، جن چیزوں سے صحیح زبان پروان چڑھتی ہے اور عربی پر قدرت حاصل ہوتی ہے ان میں سے ایک تلاوت قرآن اور حفظ قرآن ہے، لہذا قرآن کی تعلیم پر حتی المقدور توجہ صرف کرنا چاہئے، (تلاوت قرآن اور حفظ قرآن کے اثرات بہر حال بچے کی زبان پر مرتب ہوتے ہیں خواہ اس کی زبان کوئی بھی ہو) کوشش کرنا چاہئے کہ گھر کے اندر اس کے ساتھ گفتگو میں اچھے اور مناسب و منتخب الفاظ استعمال کیے جائیں، یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ عرب والدین کا بچہ عربی زبان میں مہارت حاصل نہ کر پائے، کم از کم گفتگو کی حد تک تو اس کو عربی زبان پر دسترس حاصل ہی ہونا چاہئے (یہی معاملہ ہر زبان بولنے والے بچوں کا ہے، اسی پر قیاس کرنا چاہئے)۔

۶۔ دونوں زبانوں سے متعلق گھر میں ثقافتی مواد کی فراہمی کو یقینی بنانا چاہئے، مثلا کتابیں، اخبارات، میگزین وغیرہ منگانا چاہئے، بالخصوص جب اجنبی شہر میں قیام ہو تو اپنی اصل زبان سے متعلق مواد ضرور فراہم کرے، تاکہ بچہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لے کہ اس کی مادری زبان یہ ہے اور خارجی زندگی میں اس کا بھرپور ثقافتی استعمال موجود ہے، یہ اس لیے ضروری اور اہم ہے کیونکہ وہ جہاں پر موجود ہے وہاں باہر کی دنیا میں اور گھر سے باہر کی زندگی میں محض اجنبی زبان ہی دیکھے گا۔

۷۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ماں باپ گھریلو نظام میں زبان و گفتگو کے استعمال کے تعلق سے باہمی اتفاق کے ساتھ ایک نظام مقرر کر لیں اور پھر دونوں یعنی ماں باپ اس متعین نظام کی پابندی کریں، اس لیے کہ غیر مستقل ماحول اور گھر کے غیر متفق نظام میں بچے کی نہ صرف لغوی صلاحیت بلکہ اس کی دیگر صلاحیتیں بھی اچھی طرح پروان نہیں چڑھ سکتی ہیں۔

ان توجیہات و نکات کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کا بچہ دونوں زبانوں سے خاطر خواہ استفادہ کرے گا، اس کی قوت تفکیر، اس کی معرفت و ذہانت کو کوئی ضرر پہنچے بغیر اس کی دنیا وسیع ہوتی جائے گی، اس کی ذہانت اور معلومات میں اضافہ ہوتا جائے گا، دونوں زبانوں کے استعمال پر قدرت سے اس کے لیے تیسری زبان سیکھنا بھی آسان ہوگا، جیسا کہ بعض نصاب تعلیم میں یہ چیز شامل ہے، اس سے بچے کو اپنی زبان پر اعتماد حاصل ہوتا ہے۔

لسانی قدرت کی نشو نما کا نقشہ

۳ماہ: بچہ مانوس آوازوں پر ہنستا ہے۔بعض آوازیں نکالتا ہے۔

۶ ماہ: واضح حروف پر مشتمل آوازیں نکالتا ہے ، جیسے آ، اوہ، دوو غیرہ۔

۹ماہ: بہت سی طرح کی آوازیں نکالتا ہے۔ کچھ الفاظ کو سمجھنے بھی لگتا ہے، جیسے ابو، امی، دادا۔

۱۲ماہ: پوری آزادی اور آرام سے آوازیں نکالتا ہے۔ بڑوں کی آواز کا اتباع کرتا ہے، بار بار استعمال ہونے والے بعض کلمات (جیسے ابو، امی، دادا) کے مفہوم کو سمجھنے لگتا ہے۔

۱۵ماہ: آوازیں نکالنے کا مرحلہ جاری رہتا ہے حتی کہ وہ پہلا کلمہ نکالتا ہے۔

۱۸ماہ: وہ مزید عام مستعمل کلمات کو سمجھتا ہے۔ جب اس کے سامنے اشیاء کے ناموں کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو وہ ان کی طرف اشارہ کرتا ہے، مثلاً پلیٹ، گلاس، پنکھا وغیرہ۔بعض ہلکے پھلکے احکامات پر عمل کرتا ہے، مثلاً منہ کھولو، ہاتھ دکھاؤ کہا جائے تو وہ اس پر عمل کرتا ہے۔اکیلا خود ہی بڑبڑاتا ہے اور تنہا ہی کھیلتا ہے۔بیس سے زائد عام الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔ماں کی لوریاں اور گیت سن کر خوش ہوتا ہے، بلکہ ماں کے ساتھ خود بھی گنگنانا چاہتا ہے۔

دوسال: بڑوں کی باتیں سننا پسند کرتا ہے۔۵۰ سے زائد الفاظ کا استعمال کرتا ہے، اس سے مطالبہ کیا جائے تو اس کو دہراتا ہے۔چھوٹے چھوٹے دو تین کلمات سے مرکب جملے استعمال کرتا ہے۔جو ترانے اور گیت سنتا ہے انھیں گنگناتا ہے۔

ڈھائی سال: بہت سے کلمات جو سنتا ہے ان کے معانی بھی سمجھتا ہے۔ ۲۰۰ سے زائد الفاظ استعمال کرتا ہے۔چھوٹے چھوٹے جملوں کے استعمال میں اضافہ ہوجاتا ہے لیکن قواعد کا کوئی لحاظ نہیں رہتا۔میں اور تم جیسی ضمیریں استعمال کرتا ہے۔اپنے آپ سے واضح انداز میں گفتگو کرتا ہے۔اپنے آس پاس کے تمام افراد کے نام جانتا ہے۔دوران گفتگو جلدی جلدی بولنے کی کوشش میں کبھی کبھی ہکلاتا ہے۔کیوں؟ اور کون؟ جیسے سوالات کرتا ہے۔قصے کہانیاں سن کر لطف اندوز ہوتا ہے۔

تین سال: کلمات اور ان کے استعمال کی واقفیت مزید وسیع ہوجاتی ہے لیکن طفلانہ قواعد جاری رہتے ہیں۔جمع کے صیغے استعمال کرتا ہے، اسی طرح ظرف کے صیغے مثلاً اوپر، نیچے استعمال کرتا ہے۔ لمبی لمبی گفتگو خود ہی کرتا ہے، اور خود ہی کھیلتا ہے۔کہاں؟ اور کس لیے؟ جیسے سوالات کرتا ہے ۔ قصے، کہانیاں اور گیت سے خاص شغف ہوجاتا ہے بلکہ ان میں سے بعض کو یاد کرلیتا ہے۔ایک سے دس تک اعداد شمار کرتا ہے اگر چہ تین سے زیادہ کا مطلب نہیں سمجھ پاتا۔ رنگوں کے نام سمجھ کر استعمال کرتا ہے، مثلاً لال، پیلا، نیلا، ہرا۔

چار سال: کلمات کو بڑوں کی طرح سمجھتا ہے۔کلمات کا استعمال بہت وسیع ہوجاتا ہے۔جملوں اور عبارتوں کا استعمال بہتر طریقے سے کرنے لگتا ہے، قواعد کے استعمال میں بچپنے کی جھلک باقی رہتی ہے۔''کیوں'' کے سوال کا اچھا استعمال کرتا ہے اور اچھی طرح سمجھتا ہے۔واقعات وحوادث کو بیان کرتا ہے، زیادہ تر حقیقت میں خیال کی آمیزش ہوتی ہے۔کہانیاں بناتا ہے۔بعض الفاظ پڑھتا ہے، لیکن یہ پڑھنا حافظہ کے ذریعہ ہوتا ہے، دیکھ کر اور جچے کر کے نہیں پڑھتا۔اپنی عمر اور اپنے گھر کا پتہ سمجھتا ہے۔خود بھی خوش کن باتیں بناتا ہے اور ہنسی والی باتیں سمجھتا ہے۔ ماضی اور مستقبل کا مفہوم سمجھتا ہے۔۲۰ یا اس سے زیادہ تک اعداد گنتا ہے، ۵ تک اعداد کی کمیت بھی سمجھتا ہے۔رنگوں کے ناموں کا بہتر استعمال کرتا ہے۔

پانچ سال: کلمات کا استعمال قریب قریب بڑوں کی طرح کرتا ہے۔مفردات کے معنی کے متعلق کثرت سے پوچھتا ہے مثلاً امانت، صدق اور کذب جیسے مفردات کا مطلب معلوم ہوتا ہے۔ اپنی تاریخ ولادت یاد کرلیتا ہے۔مستقبل کا مفہوم زیادہ سمجھتا ہے اور اس کا زیادہ اندازہ کرتا ہے۔اوقات کا مطلب سمجھتا ہے۔اور بعض بچے گھڑی دیکھنے پر بھی قادر ہوتے ہیں۔متعدد آسان الفاظ پڑھتا ہے۔ایک جیسے رنگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملاتا ہے، دس رنگوں تک وہ ایسا کرتا ہے، اور ان میں سے بعض کے نام بھی جانتا ہے۔

☆☆☆

ماضی کے دریچے سے

مسلم یونیورسٹی سیکولرزم کا ایک نشان

مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ

نوٹ: آج کے اخبار میں ایک خبر نظر سے گذری کہ یو جی سی نے مسلم یونیورسٹی میں اصلاحات کا مطالبہ کیا ہے، ان اصلاحات کی آڑ میں اس کے احاطہ میں موجود اسلامی تہذیب کے کچھ نقوش و آثار اس اصلاحی کمیٹی کو سخت ناگوار گذرے ہیں، حالانکہ مسلم یونیورسٹی کے پی آر او کا بیان ہے کہ ابھی تک یونیورسٹی کو اس سلسلہ میں کوئی پیغام موصول نہیں ہوا اور خدا کرے کہ موصول بھی نہ ہو، موجودہ حکومت جب سے بنی ہے تب سے وقتاً فوقتاً مسلم یونیورسٹی کے تشخص پر نت نئے انداز میں سوال اٹھائے جا رہے ہیں، اس کا اقلیتی کردار بجائے خود ایک مسئلہ اور اہم مسئلہ ہے، ان دنوں ''ندائے ملت'' کا مسلم یونیورسٹی نمبر دوبارہ اسی شکل میں شائع ہوا ہے جس کو 1965 میں شائع کیا گیا تھا اور حکومت نے اس کی کاپیاں ضبط کی تھیں، اسی میں شاہ صاحبؒ کا یہ مضمون بھی تھا، ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ مضمون آج کے ہی حالات کے پیش نظر لکھا گیا تھا، مضمون کی اہمیت وافادیت اور حالات کے پیش نظر اس کو ندائے اعتدال کے قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے (بشکریہ ندائے ملت) (مدیر)

مسلم یونیورسٹی میں جو افسوسناک واقعات پیش آئے خصوصاً طلبہ نے وائس چانسلر کے ساتھ جو گستاخانہ سلوک کیا وہ حد درجہ قابل ملامت اور یونیورسٹی کی روایات کے خلاف ہے، لیکن یہ کوئی عجیب اور نیا واقعہ نہیں ہے، یونیورسٹیوں میں آئے دن اسی قسم کے ہنگامے ہوتے رہتے ہیں، اسی صوبے میں لکھنؤ اور الٰہ آباد یونیورسٹیوں میں کیا کچھ نہیں ہو چکا ہے، جنوبی ہند کے طلباء نے زبان کے مسئلہ میں جو انقلاب انگیز شورش برپا کی تو وہ حکومت کے خلاف ایک طرح کی بغاوت تھی جس میں کثیر مالی اور جانی نقصان ہوا، لیکن ان میں سے کسی واقعہ کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی جتنی مسلم یونیورسٹی کے واقعہ کو دی جا رہی ہے، اس کا ڈسپلن تو دوسری یونیورسٹیوں کے لیے نمونہ تھا، لیکن اس کے طلبہ کی پہلی غلطی پر جو درحقیقت یونیورسٹی کے ذمہ داروں کی غلطی کا نتیجہ تھی، طلبہ اور ان کے ساتھ یونیورسٹی کو سزا دی جا رہی ہے، اس میں اصلاح کے بجائے انتقام کا جذبہ نظر آتا ہے، بغیر کسی تحقیق کے یونیورسٹی کو مجرم بنا دیا گیا، آرڈیننس کے ذریعہ اس کے اختیارات سلب کر لیے گئے اور اب حکومت اس کے دستور میں تبدیلی کرنا چاہتی ہے۔

مسلم یونیورسٹی کو اس کی خصوصیات اور کردار کے ساتھ قائم رکھنا مسلمانوں کا دستوری حق ہے، اس کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کو ایسی فضا اور ایسے ماحول میں تعلیم دی جائے جس سے ان کی ملی اور تہذیبی خصوصیات قائم رہیں، جس کا حق ہندوستان کے دستور کی رو سے ہر اقلیت کو حاصل ہے، مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا تنہا تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ ان کا بہت بڑا ملی سرمایہ اور تقریباً ایک صدی کی محنت کا پھل ہے، اس پر اس غریب قوم کی بڑی دولت اور بہترین صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں، اور مسلمانوں کی قومی زندگی پر اس کا بڑا گہرا اثر اور اہم کردار رہا ہے، ان کی بیشتر بڑی بڑی شخصیتیں اس کی پیداوار ہیں جن کا ملک ووطن کی خدمت میں بھی بڑا حصہ رہا ہے اور وہ تنہا مسلمانوں کے

لیے نہیں بلکہ پورے ملک کے لیے باعث فخر ہیں، اس لیے مسلمان یونیورسٹی میں کسی ایسی تبدیلی کو گوارا نہیں کر سکتے جس سے اس کے بنیادی کردار میں فرق آئے، اس کے تحفظ کے لیے ان کو کسی قربانی میں تامل نہ ہوگا جس کا اندازہ حکومت کو ان کے متحدہ احتجاج سے ہو گیا ہوگا، اور یہ مسرت کا مقام ہے کہ مدتوں کے بعد ان میں ایسا اتحاد دیکھنے میں آیا کہ نیشنلسٹ مسلمانوں میں بھی کوئی قابل ذکر شخصیت حکومت کی پالیسی کی مؤید نہ مل سکی اور چھاگلہ صاحب کو اس کا شکوہ کرنا پڑا، اس حیثیت سے مسلمانوں کو چھاگلہ صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے اپنے طرز عمل سے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی، مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ تنہا مسلمانوں کا مسئلہ نہیں بلکہ ہندوستان کے دستور کے احترام اور اقلیتوں کے مسلمہ دستوری حق کے تحفظ کا مسئلہ ہے، اسی لیے بہت سے منصف مزاج غیر مسلم بھی اس مسئلہ میں مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ کسی میں اتنی جرأت تو تھی نہیں کہ وہ مسلم یونیورسٹی کے لیے اسلامی کردار کی ضرورت ہی سے انکار کر دے اس لیے رجعت پسندی، فرقہ پروری، سیکولرزم، متحدہ قومیت اور قومی یکجہتی کی آڑ میں اس کے کردار کو مٹانے کی کوششیں کی جارہی ہے۔ اسلامی کردار نہ رجعت پسندی ہے نہ فرقہ پروری اور نہ سیکولرزم اور قومی وحدت اور یکجہتی کے خلاف ہے۔ اسلامی کردار کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کوئی دینی درسگاہ یا تبلیغی ادارہ ہے جس میں کسی غیر مسلم کی گنجائش نہیں، اس کے دروازے آج سے نہیں بلکہ علی گڑھ کالج کے قیام کے زمانہ سے تمام فرقوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور ہر زمانہ میں اس میں غیر مسلم طلبہ کی معقول تعداد رہی ہے جن میں بعض نامور شخصیتیں بھی ہوئیں اور اب تو یونیورسٹی میں ایک تہائی سے زیادہ غیر مسلم طلبہ ہیں، اور انجینئرنگ، پالی ٹکنک اور ڈاکٹری کے شعبوں میں ان کی اکثریت ہے، اسٹاف میں بھی بہت سے غیر مسلم اساتذہ ہیں جن میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا جاتا۔ غیر مسلم طلبہ کے قیام کے لیے مستقل ایک ہوسٹل ہے، مسلم یونیورسٹی نے اس زمانہ میں جب اس پر انگریزوں کا سایہ تھا، مولانا محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی، ڈاکٹر انصاری، عبدالمجید خواجہ، تصدق احمد شروانی، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر سید محمود اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے قوم پرور جنگ آزادی کے مجاہد اور قافلہ سالار پیدا کیے۔

جنگ آزادی کے اولین قائد و رہنما وہ لوگ تھے جو اسلامی کردار کا مجسم پیکر تھے، حضرت شیخ الہندؒ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، اور مولانا حفظ الرحمٰن کی قوم پروری اور وطن دوستی سے کون انکار کر سکتا ہے، یہ وہ شخصیتیں ہیں جنھوں نے موجودہ قوم پروروں کو قوم پروری کا سبق پڑھایا ہے، لیکن وہ اسلامی کردار کے سب سے بڑے حامل اور محافظ بھی تھے، اسلامی کردار اور قوم پروری میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسلام میں جس طرح دین و ملت کے حقوق و فرائض ہیں اسی طرح قوم و وطن کے بھی ہیں اور ایک سچا مسلمان ہی ان دونوں کے حقوق کو ادا کر سکتا ہے، اگر مسلم یونیورسٹی میں قوم پروری کے خلاف کچھ واقعات اور مثالیں مل جائیں تو اس سے کون یونیورسٹی خالی ہے، اس معاملہ میں مسلم یونیورسٹی کی تاریخ ہندو یونیورسٹی سے زیادہ روشن ہے، نان کو آپریشن کی تحریک کے زمانہ میں جب ہندو یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد نے گاندھی جی کو یونیورسٹی کے پاس پھٹکنے نہیں دیا تھا، مسلم یونیورسٹی کے فرزندوں نے اس کے بالمقابل ایک قومی یونیورسٹی قائم کر دی، جس نے انگریزوں کی غلامی کے دور میں ملک کے نوجوانوں کو وطن کی آزادی اور اس کے لیے ایثار و قربانی کا سبق دیا، اور آج بھی اس یونیورسٹی کا قدم قوم پروری میں سب

سے آگے ہے۔

البتہ اسلامی کردار میں ایسی قوم پروری کی گنجائش نہیں ہے کہ اس کے لیے دین وملت سب نثار کر دیا جائے اور مسلمان اپنی تہذیب و روایات کو چھوڑ کر اکثریت میں ضم ہوجائیں ، یہ قوم پروری اور سیکولرزم کے بھی سراسر خلاف ہے، سیکولرزم کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرقہ کو اپنی ملی خصوصیات قائم رکھنے کی پوری آزادی ہو، جس کی ضمانت ہندوستان کے دستور کے اندر موجود ہے۔ جارحانہ اورانضمامی قوم پرستی کا یہ تصور کہ اقلیت اکثریت میں ضم ہوجائے اور اپنی ہستی فنا کردے فرقہ پروروں کا پیدا کردہ ہے جن کو اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کا وجود ہندوستان میں گوارا نہیں ہے۔

فرقہ پروروں سے تو کوئی شکایت نہیں ، ان کا تو مقصد ہی مسلمانوں اور ہر اس چیز کی مخالفت اور اس کی تخریب ہے جس کا تعلق مسلمانوں سے ہو، اس لئے مسلم یونیورسٹی پر ان کی یورش تو کوئی نئی چیز نہیں لیکن حکومت ایسے اقدامات کے لیے کس طرح آمادہ ہوگئی جو ہر حیثیت سے اس کے لیے مضر اور جمہوریت اور سیکولرزم کے سراسر خلاف ہے، مسلم یونیورسٹی حکومت کی سیکولرزم کا ایک بڑا نشان ہے ۔چنانچہ اسلامی ملکوں کے جو سربراہ بھی ہندوستان آتے ہیں ان کو مسلم یونیورسٹی ضرور دکھائی جاتی ہے اس کا کردار بدلنے سے سیکولرزم کا ایک بڑا نشان مٹ جائے گا، اور کسی بہانہ سے بھی اس کی پردہ پوشی نہ ہوسکے گی۔ مسلمانوں میں علٰحدہ بے چینی اور بد دلی پیدا ہوگی ، وہ اس کے بچانے کی جو راہ بھی اختیار کریں گے اس سے قومی یک جہتی کو صدمہ پہنچے گا جس کی ذمہ داری حکومت پر ہوگی ، اس لیے اس کو بہت سوچ سمجھ کر آئندہ قدم اٹھانا چاہئے۔

یونیورسٹی کے کردار کو قائم رکھنے کی صرف یہ شکل ہے کہ اس کے تمام شعبوں میں خواہ وہ تعلیمی ہوں یا تنظیمی مسلمانوں کی نمایاں اکثریت اور ان کا نظم ونسق ان کے ہاتھوں میں رہے، اس کی انتظامی مجالس کے نظام میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔اس کے ممبر جمہوری طریقہ پر منتخب کئے جائیں،حکومت کے نامزد کردہ ممبروں کی تعداد کم سے کم رکھی جائے۔غیر مسلم ممبر ایسے منتخب یا نامزد کئے جائیں جو مسلمانوں کی تہذیب وروایات سے واقف اور یونیورسٹی کے ہمدرد ہوں،اس کے بغیر اس کا کردار قائم نہیں رہ سکتا۔

خود یونیورسٹی میں بھی آزاد مشرب نام کے مسلمانوں کا ایک خودغرض اور جاہ پسند طبقہ ہے جو اسلامی کردار کو اپنی راہ میں حائل سمجھتا ہے مگر علانیہ اس کی مخالفت کی جرأت نہیں کرسکتا، اس لیے رجعت پسندی اور فرقہ پروری کی آڑ لے کر اس کو بدلنا چاہتا ہے۔ یہ اندرونی دشمنی یونیورسٹی کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہے، اس لیے یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد خصوصا وائس چانسلر صاحب کو اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔اصولاً یونیورسٹی کے کسی متوسل کو اس کے احاطہ کے اندر علانیہ اسلامی عقائد و تصورات کی مخالفت کی اجازت نہ ہونی چاہئے۔

اس موقع پر بے اختیار مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کی یاد آتی ہے ان میں سے کوئی بھی موجود ہوتا تو حکومت کبھی ایسا غلط اقدام نہیں کرسکتی تھی، وہ یونیورسٹی کے بنیادی کردار کو کبھی نہ بدلنے دیتے ، شاستری جی بھی اس معاملہ کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اس لیے ہم کو توقع ہے کہ وہ اس کو خوبصورتی کے ساتھ ختم کردیں گے،اور کوئی ایسی صورت نہ پیدا ہونے پائے گی جس سے حکومت اور مسلمانوں کے درمیان مزید کشمکش پیدا ہو۔

☆☆☆

شخصیات

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی تاریخ نگاری

مولانا عمیر الصدیق ندوی
دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۱۹۱۱ء میں دیسنہ میں پیدا ہوئے، پٹنہ، علی گڑھ، جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی کی نظر انتخاب میں آئے، سید صاحب نے ان کو ۳۵ء میں دارالمصنفین بلالیا، یعنی چوبیس سال کی عمر میں ان کی اس زندگی کا آغاز ہوا جس کے دامن میں ان کی قریب پچاس کتابوں کا نذرانہ شامل ہے۔

۸۷ء میں ان کا انتقال ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ دارالمصنفین میں سب سے زیادہ وقت لگانے والے تھے یعنی ۵۲ سال انہوں نے دارالمصنفین کو دے دیئے، اس امتیاز میں اب تک ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں۔

ان کی علمی زندگی کے کئی عنوان ہو سکتے ہیں اور ہیں ''مثلاً'' وہ ادیب تھے، نقاد تھے، صحافی تھے، مترجم تھے، مدیر تھے اور ایک شہرہ آفاق علمی ادارے کے ناظم تھے، لیکن ان کا سب سے روشن عنوان ان کا مورخ ہونا ہے۔

دارالمصنفین کا امتیاز بھی اسی تاریخ کے علم وفن سے ہے، سیرۃ النبی سے جو تاریخ کے مطالعہ کا سلسلہ شروع ہوا وہ صحابہ و تابعین، مفسرین ومحدثین، فقہاء وحکما، اور پھر بنوامیہ، بنوعباس، ترکان عثمانی، اندلس وصقلیہ کی تاریخ پر جس طرح پھیلا وہ اردو تاریخ کا ایسا باب ہے جس کو بے مثال کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں، تاریخ اور اسلامی تاریخ یا مسلمانوں کی تاریخ میں ہندوستان کا ذکر اپنی گونا گونی اور عرصہ درازی کے سبب ظاہر ہے کہ ناگزیر ہے، اردو میں تاریخ نویسی اٹھارویں صدی کے اواخر سے شروع ہوئی، جیسا کہ جمیل جالبی کا خیال ہے کہ اردو میں تاریخ کی پہلی کتاب قصہ واحوال روہیلہ ہے، رستم علی بجنوری کی اس کتاب کے متعلق کہا جاتا ہے یہ ۱۷۷۴ سے ۱۷۸۱ کے درمیان لکھی گئی، اس کے بعد آہستہ آہستہ ہی سہی اردو میں تاریخ نگاری کا عمل جاری رہا، فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا تو اس کے ذریعہ اس رفتار میں اضافہ ہوا، کچھ طبع زاد ہیں جیسے انتخاب سلطانیہ، تواریخ بنگالہ وغیرہ اور کچھ تراجم ہیں جیسے آرائش محفل، تاریخ شیر شاہی وغیرہ۔

فورٹ ولیم کالج کے بعد دہلی کالج، منشی نول کشور اور پھر سرسید احمد خاں یہ تین پڑاؤ ہیں جہاں تاریخ نگاری کے نقوش روشن سے روشن تر ہوتے نظر آتے ہیں۔

سرسید نے تاریخ نگاری کو محض واقعات کے بیانیہ سے نکالنے کی پہلی کوشش اس طرح کی کہ سو سال کے بعد اردو میں جدید فکر ونظر اور جدید اسلوب سے تعارف کرایا۔

شبلی کی الفاروق اور المامون جیسی کتابوں میں سرسید کا اثر صاف دیکھا جا سکتا ہے، شبلی تک اردو تاریخ نویسی گویا مکمل شکل اختیار کر گئی، دارالمصنفین اس شکل کا عکس بن کر ظاہر ہوا اور

ہندوستان کی تاریخ پر جب بزم تیموریہ، بزم مملوکیہ، عہد وسطی کے تمدنی کارنامے، فوجی نظام جیسی کتابیں سامنے آئیں تو محسوس ہوا کہ اردو کے عظیم سرمایہ میں اگر کہیں کچھ کمی تھی تو وہ پوری ہوگئی۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن وہ مورخ ہیں جنہوں نے اس کمی کو تنہا اپنی محنت سے پورا کیا، بظاہر یہ معمولی سا جملہ ہے لیکن اس کی معنویت سمجھنے کے لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے یہ الفاظ خاصے معاون ہوسکتے ہیں کہ:

''سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی شخصیت ان تاریخی شخصیتوں کے مماثل تھی جنہوں نے پوری زندگی صرف علمی کاموں اور تحقیق وجستجو میں صرف کردی، دنیا سیاست دانوں اجتماعی کام کرنے والوں اور ملت کا درد رکھنے والوں سے کبھی خالی نہیں رہی، لیکن ایک ایسا شخص جو سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے قلم کا جویا ہو اور جس کی پیاس کبھی نہ بجھتی ہو وہ اس دنیا میں نایاب تو نہیں کم یاب ضرور ہے، میں نے ایسا علمی ذہن رکھنے والے چند افراد دیکھے ہیں جن میں ایک مولانا سید سلیمان ندوی تھے، سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ ایسے ہی صاحب علم وتحقیق کی جگہ ہے''۔

ایک مورخ کے لیے علم اور تحقیق یہی دو عناصر غالبًا سب سے زیادہ ضروری ہیں اور صباح الدین صاحب میں یہ عناصر بدرجہ اتم موجود تھے اور یہ ان ہی عناصر کی کارفرمائی تھی کہ ان کے قلم نے جب ہندوستان کے عہد وسطی کی تاریخ کو اپنا موضوع بنایا تو ان کا مطالعہ علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ایسا ماخذ بن گیا جس کے اعتبار واستناد میں کوئی شبہ نہیں رہا، بزم تیموریہ سے انہوں نے یہ سفر شروع کیا اور ایک نرالے انداز سے انہوں نے دوسرے مورخین کے برخلاف فتوحات اور کشور کشائی سے گریز کرتے ہوئے تیموری بادشاہوں کی علم وادب نوازی پر توجہ مرکوز کی، نتیجہ یہ ہوا کہ سید ہاشمی فرید آبادی جیسے مورخ نے لکھا کہ:

''تاریخ ہند کا یہ وہ موضوع ہے جس پر ایک زمانہ تک انگریزوں کی خاص سیاست اور مسلمانوں کی عام غفلت کے غلاف چڑھے رہے اور مسلمان بادشاہوں کی چھ سو برس کی ساری تاریخ فقط جنگ وخوں ریزی کی ایک نفرت انگیز داستان بن کر رہ گئی، اہل اردو ضرور مصنف کے شکر گزار ہوں گے کہ مغلیہ دربار کی پوری علمی تاریخ کا یہ پسندیدہ مرقع اردو میں شائع ہوا جو بہت سی متفرق کتب ورسائل کی ورق گردانی سے مستغنی کردے گا''۔

بزم تیموریہ کا پہلا حصہ ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا، لیکن بعد میں اس کے تین حصے ہوگئے، پہلے میں بابر ہمایوں، اور دوسرے میں جہانگیر اور شاہجہاں اور تیسرے میں اورنگ زیب سے ظفر تک کا حال آ گیا۔

اس کتاب کی ضرورت اور مقبولیت نے مصنف کو تیموری بادشاہوں سے پہلے سلاطین کے اسی نہج پر مطالعہ کے لیے آمادہ کیا چنانچہ بزم مملوکیہ کے ذریعہ مملوک سلاطین کی وہ تصویر جو بہت دھندلی تھی، اس طرح روشن ہوئی کہ پہلی بار ان مملوک سلاطین کے عہد کے علماء وشعراء کے حالات اتنی تحقیق وتفصیل سے اردو میں سامنے آ گئے اور بقول مولانا ضیاء الدین اصلاحی مملوک سلاطین کی تاریخ بھی شاندار اور پرشوکت نظر آنے لگی، اس کے بعد تو صباح الدین صاحب کا قلم اس طرح رواں ہوا کہ ان کے سوانح نگار کی نظروں میں حیرت ہی حیرت نظر آنے لگی۔

ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک، ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں، ظہیر الدین محمد بابر، ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں، ہندوستان کے عہد

ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوستان سے محبت وشیفتگی کے واقعات ،اسلام میں مذہبی رواداری، مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان سے شیفتگی ومحبت کے جذبات اور بابری مسجد جیسی کتابیں صرف سلاطین اور حکمرانوں کی نہیں، خود صباح الدین مرحوم کے علمی ذوق اور تحقیق و جستجو کی خوبصورت ترین تصویریں بن گئیں۔

ان تصویروں میں انہوں نے سنجیدہ، صداقت شعار، راست گفتار اور غیر جانب داری کا رنگ جس طرح بھرا وہ یقیناً کار نمایاں ہے، اس کارنمایاں کی تفصیل بھی بیان کی گئی کہ مشرقی تاریخ نویسی بلکہ تاریخ کے دامن سے اس دھبہ کو دور کرنا تھا کہ مسلم دور حکومت مطلق العنان شہنشاہیت کا دور تھا اور اس میں معرکہ آرائی اور عیش کوشی کا تناسب سب سے زیادہ رہا یا یہ کہ اس عہد میں بہت کم تہذیبی وتمدنی کارنامے انجام پا سکے، صباح الدین صاحب نے تمدنی جلووں کو اس بلند آہنگی اور تاریخی دیانت سے پیش کیا کہ اس دور کی تاریخ سے تعلق رکھنے والے اس تاریخ پر فخر کرنے لگے اور وہ دوسروں کے لئے بھی چشم کشا ثابت ہوئے اور لوگ محسوس کرنے لگے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے قومی زندگی کے ہر رخ کو متاثر کیا اور اس کے آب ورنگ اور تب وتاب میں اپنے خون جگر سے اضافہ کیا۔

یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ان کی تاریخی کتابوں کے نام میں بزم ،جلوے، جھلک اور رواداری جیسے الفاظ کا التزام ہے اس سے خود مصنف کے تاریخی ذوق، رجحان اور مخصوص نقطۂ نظر کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے، ان کے اس بامقصد، مثبت اور تعمیری ذوق میں خود ان کی شخصیت کے اعتدال و توازن اور دارالمصنفین کے اعلی علمی وتاریخی مقاصد کے عناصر کے اجزائے ترکیبی کی کارفرمائی بھی صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا مورخانہ قلم ان کے ادیبانہ اور انشاپردازانہ جاہ وحشم کے جلو میں کیوں چلتا ہے، وہ رزم آرائیوں سے کیوں اجتناب کرتے ہیں اور بزم آرائیوں میں ان کے قلم کو کیسے کیسے سامان نشاط فراہم ہوتے ہیں، وہ عیب جو اور خردہ گر کیوں نہیں ہیں، رعنائیاں اور خوش ادائیاں ان کے دامن تحقیق کو کیوں کھینچتی ہیں، ان سوالات کے جواب کے لیے بڑا وقت چاہیے، مختصر یہی کہا جا سکتا ہے کہ جو بات ان کی تمام کتابوں اور ان کی تاریخ نویسی کی روح یا عطر کی شکل میں سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان سے محبت میں جتنے یہاں کے دوسرے باشندے شامل ہیں اسی طرح یہاں کے مسلمان روز اول سے ہندوستان سے اپنی محبت اور اس سے والہانہ تعلق کے جذبات سے سرشار ہیں، رزم ہو یا بزم وہ غیر ملکی حملہ آور، غاصب اور جارح نظر نہیں آتے بلکہ وہ خود کو ہندستان کی سرزمین، پیڑ پودے، دریا، جنگل، پہاڑ، موسم، پھل، پھول کھانے، لباس، زبان، رسم رواج اور تہذیب میں خود کو سمو دیتے ہیں۔

اس داستان کو جانبدارانہ بھی کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ جانب داری اس لیے نقص یا عیب نہیں کہ وہ صداقت، حسن، خیر، تعمیر اور مثبت طریقہ فکر کی جانب داری ہے، بحیثیت مورخ وہ مریضانہ اور متذبذب مطالعہ کو پسند نہیں کرتے، ان کے سامنے یہ نکتہ ہے کہ تاریخ نویسی میں صحت مندانہ پہلو پر اگر توجہ مرکوز ہے تو اس سے بہت سی ذہنی اور سیاسی بیماریوں کا علاج ہوتا جائے گا۔

بحیثیت مورخ وہ حکمرانوں کی بے اعتدالیوں سے واقف ہیں، مگر ان کے تاریخی ذوق کو اس سے تکلیف پہنچتی ہے کہ بعد کے مورخوں نے حکمرانوں کی زیادتیوں کو اسلام سے منسوب کرنے کی کوشش کی، ایسی تاریخ نویسی کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ قابل مواخذہ ہے کیوں اس کے ذریعہ دلوں کو جوڑنے کے

بجائے دلوں کو توڑنے کی کی نشیلی اور تباہ کن لذت سے ہم کنار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ان کا فلسفہ تاریخ صرف یہ ہے کہ تاریخ کے مواد کچے ہوتے ہیں وہ دلوں کو توڑنے اور جوڑنے دونوں کے لئے استعمال کیے جاسکتے ہیں، کسی ملک کی صرف خوں ریزی اور ہولنا کی کی داستانیں جمع کر دی جائیں تو اس کی تاریخ یقیناً قصائی کی دوکان ہوجائے گی لیکن اس تاریخ میں ایسے بھی مواد ملیں گے جن سے مہر ومحبت، دل جوئی اور دل نوازی قلم بند کی جاسکتی ہے۔

سید صاحب اپنے اسی پسندیدہ فلسفہ کے مطابق حکایات مہر ووفا جمع کرتے رہے، سر ہنری الیٹ نے ہسٹری آف انڈیا میں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کے وہ پہلو ذکر کیے تھے جن کو تاریک کہا جاتا ہے، مقصد یہی تھا کہ ہندوستانیوں کو برطانوی حکومت ایک نعمت اور سامان رحمت معلوم ہو اور اس سے بڑا مقصد یہ کہ ہندو اور مسلمان میں نفرت وعداوت کی ایک خلیج پیدا ہو، اس زہر کا تریاق جب انہوں نے عہد وسطی کی ایک جھلک میں پیش کیا تو اس احساس واعتراف کے ساتھ کہ غالبا یہ تاریخ نویسی کے اصول کے خلاف ہے، تاہم انہوں نے لکھا ہے کہ اگر محض تاریک پہلوؤں کو پیش کرنے کے لئے الیٹ مورد الزام ہے تو صرف روشن پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی وجہ سے وہ بھی اس الزام سے بری نہیں، لیکن اصل معاملہ نیت کا ہے ان کے سامنے صرف تاریخ نویسی کے فرائض ہی کی انجام دہی نہ تھی بلکہ مسلمانوں کے عہد کی جو دیدہ ودانستہ غلط تاریخ وضع کی گئی تھی اور اس سے جو مضر اثرات پیدا ہوئے ان کا ازالہ بھی مقصود تھا۔

کتاب تمدنی جلوے میں انہوں نے بلبن سے بابر تک سنسکرت کے شعراء کے اشعار پیش کیے اور بتایا کہ دربار میں ان ادیبوں اور شاعروں کی حیثیت کسی طرح فارسی اور عربی دانوں سے کم نہیں تھی، انہوں نے ایک دوسرے کے اثرات قبول کرنے میں بہت سے ہندو راجاؤں کے محلوں کی تفصیل پیش کی اور بتایا کہ یہ سب ہندو اشتراک کے نئے ذوق اور نئے طرز کے بہترین نمونے تھے۔

یہ جذبہ ان پر اس قدر غالب تھا کہ مذہبی رواداری کا انتساب انہوں نے اس طرح کیا کہ:

انتساب: ہندو مسلم کی یگانگت، موانست اور جذباتی ہم آہنگی کے نام، یہ انتساب ان کے اس تاریخی شعور کا ترجمان ہے کہ ہندوستان کو قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی شدید ضرورت ہے اور اس کی نشو ونما میں تاریخی لٹریچر کو اس لیے اہمیت ہے کہ وہ ذہنی، نفسیاتی، سیاسی، معاشرتی حتی کہ مذہبی شعور پیدا کراتے دیکھا جائے تو علامہ شبلی کے ذہن میں دارالمصنفین کا جو تخیل تھا اس میں تاریخ کے باب میں یورپ کی غلط بیانیوں کی تصحیح تو تھی ہی، متعصب مورخوں نے ہندوستان کی مسلم تاریخ میں جس تعصب سے کام لیا اور اعتراضات کیے ان کا بھرپور جواب اور استدلال کے ساتھ دفاع کیا جانا بھی تھا، یہ دونوں کام قدرت نے جیسے سید صباح الدین صاحب کے لیے خاص کر دیے تھے، انہوں نے اسلام اور مستشرقین اور تاریخ ہند کے متعلق اپنی کتابوں سے جس خوبی سے یہ فرض انجام دیا وہ دارالمصنفین کی تاریخ کا سنہرا باب ہے اور اسی بنیاد پر ان کو شبلی وسلیمان کے بعد دارالمصنین کا تیسرا سب سے بڑا رکن کہا گیا، ان کی تمام علمی زندگی بس اس شعر کی تفسیر تھی کہ:

میں کہ مری نوا میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

☆☆☆

❑ اسلامی تعلیمات

حب دنیا کا علاج سورہ ''والعادیات'' کی روشنی میں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
ترجمہ از: طلحہ نعمت ندوی

والعادیات ضبحاً فالموریات قدحاً.....فوسطن به جمعاً.

درج بالا آیات میں گھوڑے اور اس کے مختلف حالات واوصاف کی قسم کھائی گئی ہے، مفسرین نے دیگر اقسام قرآنی کی طرح اس قسم کی بھی مختلف توجیہیں کی ہیں اور اس کی تشریح میں مختلف اقوال پیش کئے ہیں، ان میں سب سے بہتر تاویل یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن پاک مذکورہ بالا اوصاف سے متصف اور یہ سارے کام انجام دینے والے گھوڑے کی قسم کھا کر باعمل اور صاحب حوصلہ مسلمانوں کو اس کی اہمیت بتانا اور اس کے مقام ومرتبہ کو اجاگر کرنا چاہتا ہے، تاکہ وہ اس کی قدر و قیمت پہچان کر اسے جہاد کے لئے تیار کرسکیں اور اس کے اندر میدان میں لڑنے کی صلاحیت پیدا کریں، نیز خود بھی شہسواری اور گھوڑ سواری کی مشق پر توجہ دے کر ارشاد قرآنی "وأعدوا لهم مااستطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدوّ الله وعدوّكم" کی تعمیل کریں۔

یقیناً یہ تاویل بڑی حکمت آمیز بھی ہے اور شریعت اسلامی کی روح سے پوری طرح ہم آہنگ بھی، کیوں کہ یہ دین قوت وطاقت، جانبازی وجواں مردی، شجاعت وبہادری، امن وسلامتی اور پاکیزہ اور شریفانہ جذبۂ جہاد کی خصوصیات کا حامل ہے، دیگر آیات واحادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، لیکن یہ مفہوم بالکل الگ ہے، سیاق کلام سے اس کی تائید نہیں ہوتی، نہ آیت مابعد "انّ الإنسان لربه لكنود" سے (جو بہ ظاہر پوری سورت کا مرکزی مضمون معلوم ہوتا ہے اور جس کی تمہید میں اوپر کی آیات میں گھوڑے کے اوصاف ذکر کئے گئے ہیں۔) اس کا کوئی ربط نظر آتا ہے۔ میں ان آیات کا ایک دوسرا مفہوم ذکر کررہا ہوں، امید ہے کہ قارئین اور اہل علم کو اس پر شرح صدر ہوگا اور فہم قرآن کی ایک نئی حلاوت ولذت محسوس ہوگی، حکمت وتدبر اور عبرت ونصیحت کی ایک نئی راہ سامنے آئے گی۔

مذکورہ بالا آیات قسم کو تمام اقوال مفسرین سے قطع نظر کرکے خالی الذہن ہوکر اور آیت "ان الإنسان لربه لكنود" کے ساتھ ملا کر پڑھئے، فوراً ایک نکتہ آپ کے ذہن میں آئے گا جس پر آپ جتنا اللہ کا شکر کریں کم ہے۔

دیکھئے اس آیت میں اللہ نے گھوڑے کو متعدد اوصاف سے متصف کیا ہے، اور اس کے بہت سے کام بتائے ہیں جو سب کے

سب ایک ہی محور کے اردگرد گھومتے ہیں، اور وہ ہے اپنے مالک کی وفاداری وجاں نثاری اور اس کے لئے ایثار کا جذبہ، گھوڑا وہ جانور ہے جو اپنے مالک کے آرام کی خاطر جان کی بازی لگادیتا ہے، اس کے آرام کے لئے اپنی ساری راحتیں قربان کردیتا ہے، اس کی رضا کی خاطر وہ اپنی کوئی زندگی اور اپنا کوئی حق نہیں سمجھتا، سخت خطرات ہوں، آگ ہو، دریا ہو، ہر جگہ بے خطر کود پڑتا ہے، بھوک پیاس کی شدت جھیل لیتا ہے، ساری مشکلات برداشت کرتا اور صبح وشام مالک کے اشارے پر دوڑتا رہتا ہے، اور اتنی تیز دوڑتا ہے کہ زمین سے اس کے پیروں کی رگڑ سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں اور گرد وغبار اڑنے لگتی ہے، بالآخر وہ اپنے مالک کو لے کر مجمع میں پہنچ جاتا ہے، قرآن پاک نے اس صورت حال کی جو تصویر کشی کی ہے اس سے بہتر کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، یہ ساری وفاداری وہ ایک انسان کو اپنا مالک ورازق سمجھ کر پیش کرتا ہے، حالانکہ وہ اس کا مالک ہے بھی نہیں، ایک ایسے شخص کے لئے جس کا اس کی جنس سے کوئی تعلق نہیں وہ یہ ساری مشقتیں جھیل لیتا ہے، یہ ایک جانور کی وفاداری کا نمونہ ہے جو عقل وشعور اور قوت گویائی دونوں سے محروم ہے۔

پھر انسان جیسی شریف اور عقلمند مخلوق کا اپنے رب وخالق اور آقا کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہئے، لیکن انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے، اس کے پالتو جانور اور اس کے تابع فرمان غلام اس کے لئے مرقع عبرت ہیں۔

"إنه علىٰ ذلك لشهيد" وہ زبان حال سے اس کی گواہی بھی دیتا ہے اور زبان قال سے اس کا انکار بھی نہیں کرتا، اگر وہ زبان سے اس کا انکار کرے تو اس کے حالات اور طریقۂ زندگی بانگ دہل اس کی بدعملی اور اپنے رب کی نافرمانی کا اعلان کرتے ہیں۔

"وإنه لحب الخير لشديد" ۔اس کا فطری سبب یہ ہے کہ انسان ایک ساتھ دو خدا کی عبادت نہیں کرسکتا۔ما جعل الله لرجل من قلبين في جوفه (اللہ نے ایک شخص کے اندر دو دل نہیں بنائے ہیں) ضرب الله مثلاً رجلاً فيه شركاء متشاكسون ورجلاً سلماً لرجل هل يستويان مثلاً؟ (اور اللہ تعالیٰ مثال بیان کررہا ہے ایک ایسے غلام کی جس کے مختلف حصہ دار مالک ہوں، اور ایک ایسے غلام کی جو صرف تنہا ایک شخص کا ہے، کیا دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟)

خلاصہ یہ ہے کہ اس سورت میں انسان کی ایک بیماری ذکر کی گئی ہے، یعنی اس کی ناشکری، اپنے رب کا انکار، پھر اس بیماری کی علت بتائی گئی ہے، کہ وہ مال کی محبت رکھتا ہے، "وإنّه لحبّ الخير لشديد" ۔اخیر میں اس کا علاج بتایا گیا ہے چنانچہ فرمایا گیا، افلا يعلم إذا بعثر ما في القبور وحصل ما في الصدور (کیا اسے وہ وقت نہیں معلوم جب وہ قبر سے نکالا جائے گا اور جو کچھ سینوں میں ہے وہ ساری باتیں ظاہر ہوجائیں گی۔) آخرت پر ایمان اور موت کا تذکرہ آنکھوں سے پردۂ غفلت دور کردیتا ہے، اور دنیا کے نشہ سے بیدار کرتا ہے، اسی لئے رسول پاک علیہ الصلاۃ والسلام نے ارشاد فرمایا "اكثروا ذكر هاذم اللذات يعني الموت" (لذتوں کو توڑنے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو)۔

☆☆☆

فکر اسلامی

(قسط-۲۱)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

قوم کو علمی و ادبی میدان میں خود کفیل ہونا چاہیے: یہ سچ ہے بلکہ اظہر من الشمس ہے کہ وہ قوم آج تک خود کفیل نہ بن سکی جس نے ہمیشہ غیروں کے سرمایہ پر تکیہ کیا، مولانا ہر میدان میں اسلام کے غلبہ کے خواہاں تھے اور ملت اسلامیہ کو اپنے پیروں پر کھڑی دیکھنا چاہتے تھے، اس کے لئے جن اسباب کو اختیار کرنے کی ضرورت پڑے ان کو اختیار کرنے کی مؤثر و بھرپور دعوت دیتے تھے، وہ ایک مفکر تھے اس لیے اسباب سے بے خبر نہ تھے لیکن ساتھ ہی ایک عارف تھے اس لیے اسباب اختیار کرنے کے بعد تقدیر پر توکل کرتے تھے، دانشوروں کے مجمع میں کی گئی ایک گفتگو کا اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''اس مسلم ملک کو علمی، ادبی وفکری میدان میں بھی آزاد وخود کفیل ہونا چاہیے ان کو علم وادب، شاعری اور اسلوب تحریر میں بھی باہر کا غلام، دست نگر اور باج گذار نہیں ہونا چاہیے، ادب و شاعری میں بھی کسی ایسے طبقہ یا افراد کا ذہنی طور پر غلام ہونا، اس سے بہ شدت مرعوب ہونا، اور اس بارہ میں احساس کہتری میں مبتلا ہونا، اور افکار، ادبیات کو باہر سے درآمد (Import) کرنا بڑا خطرناک ہے، اور اس راہ سے ایک ملک اور ایک نسل ذہنی ارتداد کے راستہ پر پڑ سکتی ہے، آپ کو اپنے ادیب و شاعر پیدا کرنے چاہئیں، اور ان مسلمان شعراء وادباء کو اپنا ہیرو بنانا چاہئے، جنہوں نے اسلامی دائرہ کے اندر رہ کر زندگی کی روح پھونکی اور ادب و شاعری کو صحیح رخ دیا، جیسے آپ کے یہاں کے قاضی نذر الاسلام، اور عالم اسلام کے علامۂ اقبال۔

میں نے اس سلسلہ میں تاتاریوں کا واقعہ یاد دلایا کہ وہ پوری اسلامی سلطنت کے فاتح اور سیاسی طور پر عالمِ اسلام پر قابض ہو گئے تھے، ان کے پاس اپنا ادب، اپنی تہذیب، نظامِ سلطنت اور ایک متمدن دنیا پر حکمرانی کے لئے کوئی قانون نہ تھا، اس میں وہ مسلمان دانشوروں اور فضلاء کے محتاج تھے، اور انہوں نے ان سے مدد لی، اس احتیاج اور استعانت نے ان کو رفتہ رفتہ اسلام کا قائل اور اس کا حلقہ بگوش بنا دیا، میں نے صفائی سے کہا کہ:

میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ قوم ہمیشہ خطرہ میں رہے گی اور کبھی پورے طور پر آزاد نہیں ہو سکتی، جب وہ علمی ادبی (Cultural) حیثیت سے کسی دوسری قوم کی باج گذار یا شرمندۂ احسان ہو، جو قوم غالب ہوگی اس کا وہ اثر مانے گی، اور اس کے معیار واقدار (Ideals & Values) مستعار لے گی، اور آخر میں اس کا امکان ہے کہ اس کا مذہب بھی اختیار کر لے''۔ (کاروان زندگی ج۳ ص۶۱-۶۲)

تفاخر بالاسلاف میں غلو درست نہیں: یہ گفتگو تو پاکستان میں ہوئی لیکن جو ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے وہ بہر حال صفائی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور پوری جرأت وصراحت کے ساتھ ان نقائص کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو آج کل تقریباً ہر ملک

کے علماء کی اکثریت میں عام ہوگئے ہیں، جس کے سبب حالات کی تبدیلی ایک خواب معلوم ہوتی ہے، جہاں اور نقائص نہیں وہاں اسلاف کے نام پر بہرحال روایت پرستی اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ سیرت کی روشنی میں کوئی مکمل اسلامی نظام نظر نہیں آتا، جو کچھ اسلامیت نظر آتی ہے، اس کو سیرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بس پیوند کاری ہی کہا جاسکتا ہے:

''ان میں سے ایک اعتقادی اور سیاسی انتشار ہے، دوسرا علماء کے عوام کے ساتھ رابطہ کی کمی، تیسرا علماء میں عام طور پر ہمارے اسلاف کی طرح زہد کا رجحان، اس توکل اور استغناء اور زندگی کی سادگی اور ایثار کی کمی ہے جس میں اسی ملک کی تخصیص نہیں، دوسرے اسلامی ممالک بھی شامل ہیں، اس سلسلہ میں قریبی اسلافِ کرام کی کچھ مثالیں بھی دی گئیں۔

چوتھا تہذیبی ولسانی تعصب اس ملک کے لئے سخت خطرناک ہے، اور ہمارے علماء کو اس کو ختم کرنے کے لئے پوری جدوجہد کرنی چاہیے، پھر میں نے تفاخر بالانساب کی طرح تفاخر بالاسلاف میں غلو ومبالغہ پر تنقید کی، اور کہا کہ ہر وقت اسی کی رٹ لگائے جانا، اور ہر وقت اسی کا وظیفہ پڑھنا کچھ مفید نہیں کہ ہمارے اکابر ایسے تھے، ہمارے اسلاف ایسے تھے، کوئی ملت اور کوئی دعوت تاریخ سے نہیں چلتی تحریک سے چلتی ہے۔'' (کاروان زندگی ج ۳ ص ۳۷)

مدارس اسلامیہ کا نصب العین: مدارس کا نصب العین تحریک ہونا چاہیے نہ کہ تاریخ کا بیان اور اس پر فخر اور آج کے دور میں جمود بلکہ تعطل پر بھی صبر ورضا بتانے والے بتاتے ہیں کہ اب تو بعض ارباب مدارس اس پر بھی راضی ہیں کہ اگر ایک آدھ افراد بھی پیدا ہو جائیں تو کافی ہے کہ اسی سے مدرسے کے وجود کو کارآمد سمجھنا چاہیے، مولانا اس روش کے خلاف تھے مدرسی نظام کی مروجہ صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا کے یہ الفاظ پڑھیے:

''میں نے صفائی سے کہا کہ مدرسے اور دینی دعوتیں تاریخ سے نہیں چلتیں، تحریک سے چلتی ہیں، ہر وقت اسلاف واکابر کا نام لینا اور ان پر فخر کرنا اور ''پدرم سلطان بود'' کا نعرہ لگانا، سننے والوں کو بھی ملول ومتوحش کر دیتا ہے'' (کاروان زندگی ج ۳ ص ۱۷۷)

زبان و بیان کی ضرورت: ہماری دنیا میں ایک طبقہ کے بہت سے حضرات زبان و بیان کی قیمت کو نہ صرف شمار ہی نہیں کرتے بلکہ اس کی محنت کرنے والوں پر بھی نقد کرتے ہیں، بھوپال میں رابطہ ادب اسلامی کے سیمینار میں مولانا نے فرمایا:

''یہ بھی عرض کیا گیا کہ ان غلط فہمیوں کو دور ہونا چاہئے کہ ہمارے عہد کے داعیوں کو زبان وبیان کی ضرورت نہیں، جو لوگ زبان کی اصلاح کو پیشہ ورانہ شے سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، ان کے سامنے حضرت حسن بصریؒ سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ مجدد سرہندیؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ وغیرہ کی مثال سامنے رہنی چاہیے''۔ (کاروان زندگی ج ۵ ص ۵۴)

ایک حقیت کا انکشاف: ''یہ بھی تاریخ کا عجیب معمہ ہے کہ جس طبقہ کو سب سے زیادہ حقیقت شناس فراخ دل اور متوازن ہونا چاہئے تھا، اسی طبقہ نے کوتاہ نظری اور تنگ دلی کا مظاہرہ کر کے خود کو حرف ونقش میں قید کر لیا ہے، جن لوگوں کا قلب و جگر جمال وکمال سے آراستہ ہونا چاہئے تھا، انھوں نے ہی ادب کو چند محدود اصطلاحات اور مقاصد تک محدود کر لیا ہے، اقبال نے صحیح کہا ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر''

(کاروان زندگی ج ۵ ص ۵۴)

(**جاری**.....)

❑ لائحہ عمل

ہندوستانی مسلمانوں کیلئے مولانا آزاد کی رہنمائی

(ایک تقریر جو نشان راہ ہے)

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

ہندوستانی مسلمان ایک ایسی ملت کا نام ہے جس کا ماضی عنوان ترقی وکمال ہے، جس کا حال بے حال ہے اور جس کا مستقبل نہیں معلوم کہ نام عروج ہے یا نشان زوال ہے ۔آئندہ کے بارے میں یقین معدوم، امید موہوم اور تقدیر غیر معلوم ہے۔ ماضی درخشان تھا جو گذر گیا، مستقبل پردہ غیب میں ہے جو کچھ ہمارے بس میں ہے وہ حال ہے اور حال میں صحیح سمت میں صحیح طریقہ سے سعی عمل کرنے پر روشن مستقبل کا انحصار ہے، صحیح سمت میں اور صحیح انداز میں کوشش کس طرح کی جائے اس کا انحصار چند چیزوں پر ہے، ایک یہ کہ اپنے حالات سے متعلق مکمل شعور اور آگہی اور دوسرے اپنے مذہب کی روح سے مکمل واقفیت اور پھر صحیح منصوبہ بندی اور پھر عزم عمل۔

جہاں تک حالات کا تعلق ہے تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی بعض احیائی تحریکوں نے مسلمانوں کو معاشی سیاسی اور تعلیمی اعتبار سے پسماندہ رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ مسلمانوں کا وجود بھی انہیں برداشت نہیں، مذہب اور تہذیب کو برداشت کرنے کا سوال تو بعد میں آتا ہے، مسلم مکت بھارت ان کا نعرہ ہے بابری سے دادری تک افسوسناک واقعات کا جانکسل سلسلہ ہے، گجرات کے فسادات حکومت کی نگرانی میں کرائے گئے تھے اور آج وہ حکومت مرکز میں بھی حکمراں ہے جس کی تشکیل کا بنیادی عنصر مسلمان دشمنی ہے۔ اس ملک میں مسلمانوں کے مسائل کا تعلق بڑی حد تک اسی رویہ سے ہے جو احیائی تحریکوں نے اختیار کر رکھا ہے، چنانچہ مسلمانوں کی تہذیب، ثقافت تعلیمی اداروں، زبان اور پرسنل لا کو خطرہ اسی طرح کی تحریکوں سے ہے اور یہ عناصر مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی ترقی میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ جب ہم ہندوؤں کی احیائی تحریکوں کا نام لیتے ہیں تو اس سے ہماری مراد پوری ہندو قوم نہیں ہوتی ہے، ہندو قوم کی اکثریت احیائی ذہنیت نہیں رکھتی اور تمام ہندو مسلمانوں سے نفرت نہیں کرتے، بہت سے غیر مسلم ادیبوں نے دادری کے مسلم کش حادثہ پر احتجاج کرتے ہوئے ساہتیہ اکیڈمی کا ایوارڈ اور پدم شری ایوارڈ واپس کر دیا، یہ اہم واقعہ مرغ بادنما کی حیثیت رکھتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انصاف اور شرافت اس ملک میں زندہ ہے، فرقہ پرستوں کو ادھر کچھ عرصہ سے فربہی ملی ہے لیکن یہ موٹاپا جسم کا ورم ہے جو صحت مندی کی علامت نہیں، فرقہ پرستی کے غبارہ کی ہوا کچھ عرصہ میں نکل جائے گی، زیادہ تر ہندو اور اس ملک اقلیتیں اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ہندوستان کی سرزمین مختلف نسلوں اور تہذیبوں اور مذہبوں کے قافلہ کی منزل رہی ہے، سیکڑوں سال سے ہندوستان کا وجود اس تکثیریت کے سانچہ میں ڈھل چکا ہے اور اس سانچہ کو نہ توڑا جا سکتا ہے اور نہ بدلا جا سکتا ہے، صدیوں سے ہندوستان کی تقدیر میں یہی رنگا رنگی اور یہی بوقلمونی ہے، ہندوؤں کی ایک اقلیت نے، اس حقیقت کو نہیں سمجھا جس طرح سے مسلمانوں کی ایک اقلیت نے اس صورت حال سے خود کو ہم آہنگ نہیں کیا، حال

کے اس مجمل اور مختصر تجزیہ کے بعد اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہب اسلام کی روح ان حالات میں کیا رہنمائی کرتی ہے اور اس تہذیبی اور مذہبی بوقلمونی میں ہندوستانی مسلمانوں کو کیا پیغام دیتی ہے' میرا خیال یہ ہے کہ مولانا آزاد کی بصیرت نے ان حالات میں اسلام کی روح کو سمجھتے ہوئے اور ہندوستان کے مخصوص مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے سب سے بہتر رہنمائی کی ہے اور یہ رہنمائی مولانا آزاد کی ایک تقریر میں زیادہ صاف نظر آتی ہے' مولانا آزاد کہتے ہیں:

''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں' اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں' میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون' اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں' بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں ایک خاص ہستی رکھتا ہوں' اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے' لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں' اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی' وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے' میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں' میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے' میں اس کی تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں' میں اس دعوی سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا''۔ (خطبات آزاد مرتبہ شورش کاشمیری)۔

کیا ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ صحیح ترین رہنمائی نہیں ہے جو اسلام کی روح سے واقفیت کے ساتھ حالات کے شعور اور تجزیہ پر مبنی ہے' کیا آج کے حالات میں ایک محبّ وطن مسلمان کا بعینہ یہی موقف نہیں ہونا چاہئے جس کا مولانا آزاد نے اپنے خطبہ میں ذکر کیا ہے؟

اگر مولانا آزاد کی تقریر کا یہ اقتباس اہم ہے تو اس کی اہمیت کا احساس کتنے لوگوں نے کیا ہے' یہ اقتباس اس قابل ہے کہ خوبصورت طریقہ سے اسے لکھوایا جائے' چھپوایا جائے' تقسیم کیا جائے، آسمان سے برسایا جائے اور گھروں میں اور ڈرائنگ روم میں دیواروں پر فریم کرواکے اسے آویزاں کیا جائے تاکہ صحیح راستہ کا تصور ذہن اور دماغ میں واضح رہے اور پورے طور پر راسخ ہوجائے' مولانا آزاد نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اسلام کے چھوٹے سے چھوٹے جز سے وہ دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔ مسلمانوں کے لئے کسی ملک کی طرف ہجرت نہ کرنے اور ہندوستان میں قیام کرنے کے فیصلہ کی یہ نظریاتی اساس ہے۔ یعنی مسلمانوں نے اس ملک میں رہنے کا فیصلہ اس یقین دہانی پر کیا ہے کہ کوئی ان سے ان کا عقیدہ نہ چھینے گا اور کوئی ان پر اپنی مشرکانہ تہذیب مسلط نہ کرے گا، ہندوستان کے دستور نے اس کی یقین دہانی کی ہے۔ مسلمانوں نے طے کیا ہے کہ وہ گھٹنے ٹیک دیں گے اور ہر حال میں دستور کی حفاظت کریں گے اور ہندوستان کی غالب اکثریت بھی یہی چاہتی ہے اور فرقہ واریت اور جارحیت سے نفرت کرتی ہے۔ دستور کو بچانے کی جدوجہد میں اقلیتیں بھی مسلمانوں کے شانہ بشانہ شریک ہوں گی اور اکثریتی طبقہ کے لوگ بھی بڑی تعداد میں شریک ہوں گے۔ مسلمانوں کے لئے یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ غیر مسلم اکثریت کے ساتھ ان کی زندگی نوشتہ تقدیر بن چکی ہے' وہ چاہیں یا نہ چاہیں ان کو اس ملک میں اسی حال میں رہنا ہے' دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی طرح وہ اس ملک کی آبادی کا ناقابل انکار حصہ ہیں' یہی قدرت کا فیصلہ ہے' اور اسلامی علوم کے ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ قدرت کا یہ فیصلہ عظیم امکانات کا حامل ہے' بشرطیکہ مسلمان اپنے اندر وہ صفت پیدا کرلیں ان کا مذہب جس سے متصف ہونے کی انہیں دعوت دیتا ہے' مسلمانوں کو حیرانی اور برگشتگی کے عالم سے بلا تاخیر باہر آجانا چاہئے' اور ایک محبّ وطن مسلمان کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا چاہئے' مسلمانوں کے خلاف متعصّبانہ اور جارحانہ رویہ معلوم' بلکہ واقعات سے ثابت، اور روز روشن کی

طرح عیاں ،لیکن مجھے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مسلمان اپنے مسلمان ہونے کی ذمہ داریوں کو اس ملک میں ادا نہیں کر رہے ہیں' کیا مسلمانوں نے رکاوٹوں کے باوجود تعلیمی اور معاشی پسماندگی کو دور کرنے کی پوری کوشش کی ہے؟ کیا مسلمانوں نے اس ملک کے دوسرے مظلوم اور محروم طبقہ کے ساتھ خیر خواہی، خیر سگالی، خدمت، اور توحید اور مساوات کے عقیدہ کے تعارف کے لئے روابط قائم کئے ہیں؟ کیا ہم نے مساوات کا عملی نمونہ ان کے سامنے پیش کیا ہے، کیا ہمارے اعمال و کردار میں وہ خوبصورتی پیدا ہوگئی ہے اسلام نے جس کا ہم سے مطالبہ کیا ہے ؟ کیا ہمارے اندر وہ اخلاقی خصوصیات موجود ہیں جن کا تجربہ کر کے برادران وطن یہ محسوس کریں کہ مسلمان ایک شریف انسان اور بہتر پڑوسی اور اچھا شہری ہوتا ہے' اس کا پڑوسی ہونا محلّہ کے لوگوں کے لئے اطمینان کی بات ہوتی ہے' اس کو اپنے کارخانہ میں اور اپنی کمپنی میں ملازم رکھنا کارخانہ اور کمپنی کی ترقی کی ضمانت ہوتی ہے' کیونکہ وہ دوسروں سے زیادہ فہیم' مخلص' محنتی' کارگذار اور امانت دار ہوتا ہے' کیا ہم مسلمانوں نے خدمت ایثار اور قربانی اور اخلاقی بلندی کا کوئی نقش قائم کیا ہے؟' ہم مسلمانوں کا حال بحیثیت مجموعی اقبال کے اس شعر کے مرادف ہے:

جس کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو

کاش کہ ایسا ہوتا کہ برادران وطن کے سامنے مسلمانوں کی بہت اچھی تصویر ہوتی' وہ سمجھتے کہ مسلمان بے ایمانی اور کام چوری نہیں کر سکتا ہے' انصاف اور سچائی کا راستہ اسے پسند ہے' انسانی اخلاقی اور روحانی اقدار کے اعتبار سے وہ دوسروں سے بلند اور زیادہ ممتاز ہے' وہ مسجد میں عبادت بھی کرتا ہے اور ایمان داری کے ساتھ کام کرنے کو بھی عبادت کا درجہ دیتا ہے' وہ کمزوروں کا مددگار اور غریبوں کا غم خوار ہوتا ہے۔ خدمت خلق اس کی پہچان ہے، وہ شریف با اخلاق اور تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ وہ مذہبی تنگ نظری سے دور ہوتا ہے اور تمام انسانوں کو خدا کا کنبہ سمجھتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اسے اپنی مذہبی شناخت پر اصرار بھی ہے، اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ اپنے مذہب کو اپنے ہم وطنوں کے لئے سوغات نجات سمجھتا ہے۔ اور حکومت میں ان لوگوں کو برسر اقتدار لانے کی کوشش کرتا ہے جو منصف مزاج ہوں اور مذہبی تنگ نظری سے دور ہوں اور ہندوستان کے دستور کی روح سے متفق ہوں۔ مسلمانوں کو اس ملک میں اپنی یہ تصویر بنانی ہوگی اور مولانا آزاد کے مبنی بر اعتدال اور مبنی بر روح اسلام پیام کو ہر گھر، ہر دیوار و در ہر فرد و بشر اور تمام بحر و بر تک پھیلانا ہوگا۔ آئے ہم عہد کریں کہ ہمیں اس کام کو کرنا ہے۔

مولانا آزاد کا جو اقتباس اوپر نقل کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کے لئے اس ملک میں صحیح ترین راستہ ہے جو اسلام کے گہرے مطالعہ پر مبنی ہے' اور اسی کے ساتھ گرد و پیش کے حالات کے گہرے تجزیہ پر اس کی اساس ہے' مولانا آزاد کے اس پیغام کو ملک اور ملت میں عام کرنے کی ضرورت ہے ۔ ہندوستان کا دستور بہت اچھا دستور ہے۔ اسی دستور کی روح ہے جس کی بدولت بہت دیر سے سہی آزاد ہندوستان میں مولانا آزاد کے نام سے اردو کی ایک یونیورسیٹی قائم ہوسکی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس ملک میں دیر سویر باہمی رواداری کی فضا عام ہوگی' تلخیوں اور کدورتوں کا خاتمہ ہوگا، مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو کے طرز فکر کا بول بالا ہوگا، یہ دو علامتی نام ہیں جو سیکولرزم کے تانے بانے کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ تار حریر کے دو رنگ ہیں جس سے خوبصورت قبائے وطن تیار ہوتی ہے اور اس خوبی اور خوبصورتی کے بغیر ہندوستان کی ہمہ جہت ترقی ممکن ہی نہیں ہے اور نہ امن و آشتی کا ماحول بن سکتا ہے' فیض احمد فیض کی طرح ہمیں بھی انتظار ہے:

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

☆☆☆

❑ زبان و ادب

سخن کی تابانی: قدؔیر تابانی

(اردو کا ایک دیوانہ، اردو کے بہی خواہوں کی عدالت میں)

زبیر احمد صدّیقی
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، اے ایم یو، علی گڑھ

خطۂ ارض 'بارہ بنکی' اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں ہمیشہ مردم خیز رہا ہے۔ مزید برآں یہ کہ قدرے نامور ادیبوں اور شاعروں کے باعث یہ خطہ ہر دور میں زبان وادب کے شیدائیوں اور صاحبان ذوق وکمال کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (متوفی: ۱۸۹۲ء-۱۹۷۶ء) اسی خطۂ آب دار کے گوہر درخشاں ہیں۔ سرمایۂ ادب کا ایک گراں قدر حصہ ان کی ذات سے منسوب ہے۔ طرز تحریر اور ان کے منفرد لب ولہجہ کی چاشنی سے طالبان ادب کی تشنہ لبی ختم بھی نہیں ہو پاتی کہ اسرار الحق مجاؔز لکھنوی (ردولی، بارہ بنکی متوفی: ۱۹۰۹ء - ۱۹۵۵ء) گنگناتے جھومتے چلے آتے ہیں۔

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ، جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں؟ اے وحشت دل کیا کروں؟

مجاؔز آج بھی مجازی طور پر اردو ادب کے مرکز ''مسلم یونیورسٹی علی گڑھ'' کے در و دیوار پر بلبل ادب بن کر چہچہاتے نظر آتے ہیں۔

سرشار نگاہ نرگس ہوں، پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

اور ماضی بعید کیا، ماضی قریب کے ہی مشہور شاعر خماؔر بارہ بنکوی کے خمار آلود لب ولہجے کو بھلایا نہیں جا سکا:

چراغوں کے بدلے مکاں جل رہے ہیں
نیا ہے زمانہ، نئی روشنی ہے
.....
اکیلے ہیں وہ اور جھنجھلا رہے ہیں
مری یاد سے جنگ فرما رہے ہیں
.....
الٰہی مرے دوست ہوں خیریت سے
یہ کیوں گھر میں پتھر نہیں آرہے ہیں

اس زمین کا خاصہ ہے کہ یہ ہمیشہ خزاں سے نبرد آزما رہی ہے۔ سرورؔ بارہ بنکوی، شارؔب ردولوی، وارثؔ کرمانی، اور ناصری جیسے نامعلوم کتنے گہر آب ادب اسی خطۂ ارض کی مرہون منّت ہیں۔

بہر کیف بارہ بنکی کی ادبی یا تاریخی اہمیت سے قطع نظر، اس خطے کے ایک چھوٹے سے گاؤں 'احمد پور چوکی' کے ایک مرحوم شاعر کے ادبی شوق وذوق پر (مکتوب نگاری اور شاعری کے حوالے سے) مختصر تبصرہ مقصود ہے۔ جس کی شوخیٔ تحریر اور حسن کلام نے ناچیز کو اُس عمر خام میں ہی ادب کی زلفوں سے الجھا دیا تھا کہ! زلفوں کے پیچ وخم چہ معنی دارد؟ ادب کے مفہوم سے ہی نا آشنا تھا۔ مگر زبان وادب کا یہ شیدائی بڑی خوبصورتی اور لگن سے بغیر یہ سوچے ہوئے ایک ماں کی طرح لوریاں سناتا رہا کہ! بچے کی مسکراہٹیں اسکے عقل و فہم کی ضامن نہیں ہوتیں۔ اردو زبان وادب کی تزئین میں مشغول یہ دیوانہ کوئی اور نہیں، قدؔیر ہے۔ جو قدؔیر تاباں شفقی کیتابانیوں سے

قدیر تابانی بن کر زمانے سے یوں گویا ہوا۔

دیوانے کو دیوانہ سمجھ بوجھ کے کہیے
دیوانہ سمجھ بوجھ کے دیوانہ بنا ہے
تنکوں سے ہوا کرتی ہے تعمیر نشیمن
اجزائے حقیقت ہی سے افسانہ بنا ہے

وہ لمحے آج بھی نقش ہیں جو قدیر تابانی کے ہمراہ گزرے تھے۔۹۳ء کے آخری ماہ تھے،موصوف اپنے گاؤں کے ہی ایک چائے خانے میں تشریف فرما تھے۔ایک شاعر صاحب۲ کے توسط سے ملاقات ہوگئی۔اس سے قبل ایک اتفاق امروہہ کے ایک ادبی مشاعرے میں بھی ہوا تھا، جو 'دیدن' تک ہی محدود تھا۔بہر حال علیک سلیک کے بعد گفتگو شروع ہوئی،لیکن بارہ تیرہ سالہ خام عمر کا بچہ تقریباً نصف صدی کے ماہ وسال کا تجربہ رکھنے والے مرد کہنہ مشق سے کیا گفتگو کر سکتا تھا۔بس یوں ہی ایک بالغ النظر ادیب کے سامنے ایک طفل اپنی زبان کے تلفظ سنوار رہا تھا۔میرے دو چار روز کے قیام میں یہ سلسلۂ ملاقات اس قدر دراز ہوا کہ گھنٹوں مقامی قمرالدین صاحب کی [کرانے کی]دوکان پر ملاقاتیں ہونے لگیں۔اگلا ماہ رمضان تھا،عید اور عید کے بعد پھر وہی مدرسہ کی زندگی،لیکن 'جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے،ان مختصر ملاقاتوں نے ایسا اثر دکھایا کہ مدرسہ کی مصروف و پابند زندگی میں بھی موصوف کو خط لکھنے پر دل کے ہاتھوں مجبور ہوگیا، پھر تو گویا خطوط کا ایک سلسلہ چل نکلا۔دراصل ایک چاشنی تھی اس شخص کی گفتگو میں ، وہ اپنے بڑوں سے ملتا تھا تو بڑا مؤدب نظر آتا تھا،چھوٹوں سے تو سراپا چھوٹا ہوکر ملنا اس کی سرشت تھی، تلخ لفظوں کو پینے کا تو اس قدر سلیقہ رکھتا تھا کہ شاید کسی دائم المرض مریض نے کبھی اس شوق سے کسی طبیب حاذق کی تلخ دوا ہی پی ہو، ہماری پہلی ملاقات میں ہونے والی گفتگو کچھ اسی قبیل کی تھی،موصوف رائج سنت والجماعت کی طرف مائل تھے اور احقر تو تھا ہی ''جامع مسجد'' امروہہ کا ابتدائی طالب علم،علم کی کم مائیگی اور یہ عمر خام!''نہلے پر دہلہ'' دل پریشاں تھا یا خوش ، بہ ہر حال تذبذب کا شکار ضرور تھا کہ کس طرح اس کہنہ مشق شاعر وادیب کو اپنا قائل کرلیا،شاید ناطق لکھنوی کے اس شعر کو پڑھا نہ تھا، پڑھا تھا تو سمجھا تو قطعی نہ ہوں گا،

کہہ رہا ہے موج دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

اقتباسات:

قدیر تابانی کے ارسال کردہ چند اقتباسات پیش کرتا ہوں،جن کے مطالعہ سے ایک طرف تحریر بالا میں مندرج صفات کی تائید ہوتی ہے تو دوسری طرف موصوف کی چھوٹوں پر شفقت،علم دوستی، انکساری،ایثار،زبان اردو سے والہانہ لگاؤ اور اس کی ترویج و اشاعت میں حتی المقدور سعی کی کوششیں بھی نظر آتیں ہیں۔ملاحظہ فرمائیں:

''ہماری تمھاری ملاقات کو بس حسن اتفاق ہی سمجھو،امروہہ میں تم نے ہمیں دیکھا مگر مصلحتاً مخاطب نہیں کیا،مگر یہی کیا کم بات ہے کہ ہماری شکل آپ کی نگاہ میں بسی رہ گئی جس کی مدد سے ملاقات ہونے پر جلد ہی پہچان لیا۔ بہ ہر حال اسے ہم اپنی خوش نصیبی ہی سمجھیں گے کہ ایک اہل علم سے نیاز حاصل ہوگیا،اور خاصی دیر تک تبادلۂ خیال کے لیے بھی آپ نے وقت دیا یہ آپ کا مجھ ناچیز پر احسان ہے۔جس کے لیے ہم انتہائی شکر گزار ہیں۔آپ تعلیم جاری رکھیے،تعلیم بہت بڑی نعمت ہے، جو انسان کو قدم قدم پر اَسرار الٰہی واسرار رسالت کے ساتھ ساتھ اسرار جہاں سے روشناس کراتی رہتی ہے۔دوسری چیز یہ کہ زبان اردو کا فروغ،ادب کی سرسبزی وغیرہ کا شرف نصیب ہوتا ہے، جو کہ آئندہ نسل کے لیے مشعل راہ ہوگا۔''
[16-04-94]

ایک جگہ ادبی نشستوں کی افادیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''زبان شیریں اردو کے فروغ اور اس کی تہذیبی روایت کی ترویج واشاعت میں زبیر میاں مشاعروں کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اگر چہ اردو کی بنیادی تعلیم کا دائرہ سکڑتا جارہا ہے ،اس کے باوجود اس زبان کی مختلف ذرائع سے عصر حاضر میں جو

ترویج ہورہی ہے وہ بڑی حد تک باعث طمانیت ہے۔اردو محض ایک زبان ہی نہیں بلکہ ہماری پچھلی کئی صدیوں کی تہذیبی کمائی بھی ہے۔''

ایک اور موقع پر زبان کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ:

''تمام مضامین کے ساتھ زبان اردو کا بڑا پاس و لحاظ رکھیے۔اپنی زبان کے ساتھ دلچسپی نیز اس کی بقا اور سلامتی کے لیے سنجیدگی کے ساتھ طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ہم کو چاہیے کہ ہم اپنی زبان کے ساتھ جو ہمارا فرض بنتا ہے محاسبہ کریں۔اور ہر اردو داں فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو دیگر زبان کے ساتھ زبان اردو سے آشنا کروائے۔ورنہ موجودہ رجحان کا یہ سلسلہ دراز رہا تو اندیشہ ہے کہ موجودہ نسل تک یہ عظیم الشان زبان کا سرمایہ منتقل ہونے سے رہ جائے گا۔لہٰذا ہم کو چاہیے کہ ہم اس خطۂ ارض میں کی جانے والی ہر کوشش کو تحسین کی نگاہ سے دیکھیں۔''[29-4-94]

قدیر تابانی کی نفسیاتی پہلو پر بھی گہری نظر تھی۔انسانی فطرت و جبلّت کے عین مطابق وہ نصیحت کو حکمت کے بغیر روا نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نصیحتیں بھی حکمت و ادب کی چاشنی میں اس قدر ڈوبی ہوتی تھیں کہ طبیعت پر بارگراں گزرنے کے بجائے کیف وسرور کا ذریعہ بن جاتی تھیں۔درج ذیل اقتباس اس کی بہترین نظیر ہے۔ملاحظہ فرمائیں۔

''خود کو جذبات کی نظر کر دینا بڑائی نہیں ہے، بلکہ جذبات کو قابو میں رکھنا بڑائی ہے۔...آپ کے اس دور طالب علمی میں بیشتر ایسے مواقع آئیں گے کہ لوگ فالتو بحث ومباحثے میں آپ کا قیمتی وقت برباد کرنے کی آئے دن کوششیں کرتے رہیں گے،اور ان مواقع سے آپ بچیں گے نہیں۔ان مواقعوں کا آنا بری بات نہیں ہے،ان مواقع پر لایعنی بحث میں الجھ جانا یہ بری بات ضرور ہے۔بسا اوقات آپ محسوس کریں گے کہ آپ کا اس جگہ چپ رہنا اپنے سرمایۂ علم کی توہین ہے،ایک اہل علم ہونے کے ناطے خاموشی باعث شرم ہے ،مگر ہرگز نہیں،بس سلام کر کے آگے بڑھ جائیے اسی میں عافیت ہے۔.....''[29-4-94]

مدرسے کی خالص مذہبی فضا میں نشو نما پانے والے ذہن کو فلمی دنیا کے ہیرو کے حوالے سے کوئی نصیحت کر گزرنا آسان نہیں۔انسان بذات خود برا نہیں ہوتا بلکہ اس کے اچھے یا برے افعال اسے اچھا یا برا بنا دیتے ہیں۔دنیا کے اس مختلف النوع ماحول میں اس کا انحصار شخص کی ذاتی پسند ناپسند پر ہے کہ وہ خوبیوں کے ڈھیر میں برائیاں تلاش کرتا ہے یا برائیوں کے ڈھیر سے اچھائیوں کا انتخاب! ملاحظہ کیجیے:

''ابھی چار پانچ دن ہوئے ،اردو روز نامہ''اخبار قومی آواز لکھنؤ'' پڑھ رہا تھا۔درمیان کے صفحہ پر فلمی دنیا کے ایک ستارے راجکمار سے متعلق تحریر پر نظر پڑی یونہی وقت گزاری کے خیال سے پڑھنے لگا۔مگر یہ مقولہ کہ دنیا کا کیسا ہی گیا گزرا انسان کیوں نہ ہو اگر اس سے کوئی کام کی بات ملتی ہے تو اس کو فوراً اپنی یاد داشت کی جھولی میں محفوظ کرلو، چنانچہ فلمی ہیرو راجکمار سے کسی نے سوال کیا کہ آپ بہت زیادہ فلمیں سائن نہیں کرتے ہیں،لہٰذا جواب میں راجکمار نے کہا مجھے بہت زیادہ دولت کمانے کی ہوس نہیں ہے مجھے دراصل ''نوٹوں کی کوالیٹی پسند ہے کوانٹیٹی نہیں'' یہ جملہ دراصل میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا جسے ہم نے فوراً اپنی دل کی ڈائری میں نوٹ کرلیا،اور آپ کو بھی تحریر کر دیا تا کہ آپ بھی اس سے فائدہ حاصل کریں۔''

بصد افسوس اعتراف ہے کہ کم عمری اور نا اہلی کے باعث قدیر تابانی کے بیشتر ارسال کردہ انمول خطوط ہم سے ضائع ہو گئے،جن کا مداوا اب کسی صورت ممکن نہیں۔البتہ جو خطوط محفوظ رہ گئے ہیں تا عمر ان کی یاد تازہ کرتے رہیں گے۔اور ماضی وحال کی طرح آئندہ بھی مشعل راہ ہوں گے۔

شاعری :

قدیر تابانی وادیٔ شعر وسخن میں بالخصوص ''صنف غزل'' کو تختۂ مشق بناتے ہیں۔بقولِ خود

شاعری کی تمام صنفوں میں
مجھ کو محبوب ہے غزل خوانی

اور ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے حلقۂ ارباب سخن میں پہچانے

بھی جاتے ہیں۔ وہ سادہ، سلیس اور عام فہم زبان میں شعر کہتے ہیں۔ان کے بہت سے اشعار بلکہ بعضے بعضے پوری پوری غزلیں 'سہل ممتنع' کی عکاس ہیں۔اور یہی وہ وجہ ہے کہ آبروئے غزل خمار بارہ بنکوی قدیر کی شعر گوئی سے متعلق اس طرح اظہار رائے فرماتے ہیں۔ملاحظہ ہو:

''میں ان کو ایک عرصے سے سنتا آرہا ہوں۔شعر آسان اور سہل زبان میں کہتے ہیں ۔ شاعرانہ صلاحیت بقدر ضرورت موجود ہے۔''[۳]

بطور مثال موصوف کی یہ غزل ملاحظہ فرمائیں:

ہم تو اظہار حال کرتے ہیں
آپ ناحق ملال کرتے ہیں
بیٹھتے آپ ہیں رقیبوں میں
لوگ ہم سے سوال کرتے ہیں
بولنا کیا ہمیں نہیں آتا
آپ کا ہم خیال کرتے ہیں
آپ تو آپ ہیں یہ آئینے
کب کسی کا خیال کرتے ہیں
بہر تسکین دل ہم اہل وفا
ذکر حسن وجمال کرتے ہیں
سرفرازی انہیں کو ملتی ہے
خودکو جو پائمال کرتے ہیں
ان کو ملتی نہیں کبھی منزل
وہ جو فکر مآل کرتے ہیں
اے قدیر اس سے اور امید وفا
آپ بھی بس کمال کرتے ہیں

معنی آفرینی ،شعری حسن،تہہ داری،شعری آہنگ، نیز غزل میں موجود سادگی اور پرکاری کے مدغم تاثرات سے مخالفین غزل بھی لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ان کے کلام میں اگر جذبات، واردات، احساسات، قلبی حادثات، ذاتی تجربات (جو غزل کی خاص صفتیں ہیں) کی فروانی ہے تو دوسری طرف ان شعری اور جمالیاتی تجربات کے ساتھ ساتھ فکر کا عنصر بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

مصلحت کو چھوڑ دے ،کر جرأت اظہار حق
لیلیٰ ودارورسن کا فاصلہ دوگام ہے

.....

ہمت تو اس کی دیکھ کہ نازک سا ایک پھول
کانٹوں کے درمیان ہے لیکن کھلا تو ہے

.....

کیا انہیں کی دسترس میں گردش ایّام ہے
صبح کہہ دیں صبح ہے وہ شام کہہ دیں شام ہے

.....

مری طلب میرے احساس کے لباس میں ہے
نفس نفس اسی بے نام شے کی آس میں ہے

.....

رہائی اس کی اسیری پہ کیوں نہ ہو قرباں
قفس میں رہ کے بھی ذکر بہار کرتا ہے

قدیر تابانی غزل میں تغزل کے قائل ہیں۔وہ تغزل کو غزل کی آبرو کہتے ہیں۔تغزل کے باعث غزل پہ لگے تنگ دامنی کے الزام سے وہ قطعی نہیں گھبراتے ،اور'رشید احمد صدیقی' کے قول (غزل اردو شاعری کی آبرو ہے) سے استفادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تغزل کیوں مٹاتے ہو غزل سے
تغزل ہی غزل کی آبرو ہے

ان کے استاد تاباں شفیقی لکھتے ہیں کہ:

''ان کے مزاج میں بڑا تغزل ہے۔...انھوں نے قدیم روایت کا لحاظ کرتے ہوئے جدید زبان ولہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔اور اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔''

غیر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر تغزل کے تعلق سے کچھ گفتگو نہ کی جائے۔لہٰذا اس ضمن میں کہ تغزل کی تعبیر وتشریح کیا ہے؟ یہ کن عناصر کا مرکب ہے؟ سے متعلق پروفیسر عنوان چشتی کا یہ مختصر اور معنی خیز اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اگرچہ تغزل کی اصطلاح تعبیروں کی کثرت سے خواب پریشاں بن چکی ہے پھر بھی دو مفہوم بہت واضح ہیں ایک یہ کہ تغزل کا تعلق معانی اور مواد سے ہے خاص طور پر اس کا دائرہ حسن و عشق پر محیط ہے۔ دوسرا یہ کہ تغزل ایک طرز ادا یا رنگ ہے جس میں نغمگی ،نفاست ،لوچ اور نزاکت شامل ہے اگر تغزل کے دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھا جائے تو تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔''۵

تغزل: حسن، عشق، معانی، زبان، بیان، طرز ادا، لہجہ، ساخت، بحر اور اس قسم کے گوناگوں عناصر کا مرکب ہے۔ اور غزل کی مخصوص روح ہم سے انھیں عناصر سے تراشے ہوئے پیکر کا تقاضا کرتی ہے۔ تشریح و تعبیر کے اس آئینے میں قدیر تابانی کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

جانے کیا تھا تری اداؤں میں
مبتلا کر دیا بلاؤں میں
ہائے رے گفتگو کی شیرینی
مستیاں گھول دیں فضاؤں میں

.....

یاد آئیں وہ مجھے مست نگاہیں تیری
جب چلی بات چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

.....

انداز میں پہلے ہی سے پنہاں تھی قیامت
آنکھوں میں بھی ظالم کے خمار آنے لگا ہے

.....

اس سراپا غزل کو سنورنے تو دو
موت اسے دیکھتے ہی ٹھہر جائے گی

.....

بیدار رہ کے ہم نے گزاری تمام رات
تیرا خیال جب بھی سر شام آگیا

.....

بج اٹھے ہیں ساز دل کے تار تار
اٹھ گیا جس دم نقاب روئے یار

تابانی صاحب کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے قدیم شعرا کے کلاسیکی کلام کی اعلیٰ قدروں سے استفادہ کیا ہے، رومانیت کی خوبیوں نیز خامیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سخن گوئی کی مشق کی ہے، اور ایک حد تک کامیاب بھی رہے ہیں، یہی وہ وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں کلاسیکی اساتذہ کا رنگ نظر آتا ہے، لیکن ان کا لب و لہجہ جدیدیت سے تعبیر ہے، ان کے ابتدائی کلام سے ہی فنی بالیدگی نظر آنے لگتی ہے، منظر کشی اور قلبی واردات کا تو گویا وہ برملا اظہار کر دیتے ہیں، ان کے کلام میں ولی، مومن، سودا، غالب، اور اقبال وغیرہ قدیم شعرا کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ چند مثالیں بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

ولی کا یہ شعر دیکھیے:

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل روسوں
خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

اب **قدیر** کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

نگاہ شوق شائستہ ،مزاج یار سنجیدہ
سوال آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

مومن خاں **مومن** کا یہ شعر:

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

پیش نظر رکھتے ہوئے **قدیر** کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

بارہا ترک تعلق کی قسم کھائی ہے
اور دل ہے کہ اسی شوخ کا شیدائی ہے

مومن کہتے ہیں:

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

اب قدیر کے اس شعر میں مومن کی اس احتیاطی دعوت عمل کا نتیجہ ملاحظہ کیجیے:

مخاطب کر لیا تھا ان کو اک دن بے خیالی میں
زمانہ ہو گیا لیکن پشیمانی نہیں جاتی

یا

دزدیدہ نگاہوں سے تمھیں دیکھا تھا اک دن
مجرم ہوں، گنہگار ہوں جو چاہو سزا دو

اور **سودا** کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اب **قدیر** کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

یاد آئیں وہ مجھے مست نگاہیں تیری
جب چلی بات چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

غالب کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

اب **قدیر** کا یہ شعر دیکھیے:

ناز خود پر بہت تھا مگر
رہ گئے آئینہ دیکھ کر

اقبال کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

اور **غالب** کا یہ شعر:

تیرے وعدے پہ جیے ہم، تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

اب **قدیر** کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

روز وعدے پہ وہ نہیں آتے
روز ہم اہتمام کرتے ہیں

قدیر تابانی کے کلام میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ وغیرہ کے علاوہ ترافق کی مثالیں بھی خوب ملتی ہیں۔ ترافق کی تعریف یہ ہے کہ چار مصرعے اس طرح کے ہوں کہ ان میں سے جسے چاہیں مصرعہ اول، دوم، سوم یا چہارم قرار دے لیں، لیکن مضمون میں فرق نہ آئے۔ بطور نمونہ یہ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

ساغر ہو، خم ہو، شیشہ ہو، جام شراب ہو
فردوس آرزو ہو، مکمل شباب ہو
حسن غزل ہو، نغمہ ہو، چنگ ورباب ہو
میری نگاہ شوق کا تم انتخاب ہو

قارئین ان میں سے جس مصرعے کو جس طرح چاہیں ترتیب دے لیں، مضموں میں سرمو فرق نہیں آئے گا۔

اسی طرح یہ مصرعے ملاحظہ ہوں:

تیرگی بغض و عداوت کی مٹاتے چلیے
پیار کی شمع ہر اک گام جلاتے چلیے
پھول اخلاص و محبت کے کھلاتے چلیے
دل سے ہر نقش کدورت کا مٹاتے چلیے

اسی طرح:

للہ اک نظر ادھر دیکھ لیجیے
ناکام آرزو ہوں مگر دیکھ لیجیے
کس کا ہے تیر ایک نظر دیکھ لیجیے
پیش نظر ہے زخم جگر دیکھ لیجیے

مجموعی طور پر قدیر تابانی کی شاعری کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے یہاں شیخ، قفس، ہجر، آئینہ، رقیب، میخانہ، نشیمن، تکیہ جیسے الفاظ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان میں بعضے تو بالخصوص آئینہ، رقیب، شیخ، میخانہ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ جس کے باعث موضوعات کی سطح پر تکرار نظر آتی ہے۔ لیکن ایسے موقعوں پر فن کاری اور پرکاری کارفرما ہے۔ بقول انیس:

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

یہی وجہ ہے تکرار کے باوجود انداز بیاں میں واضح تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ فارسی تراکیب کا ایسے سہل اور آسان طریقے پر استعمال کیا گیا ہے کہ وہ موصوف کی صلاحیت پر مداومت کرتی ہیں۔ یہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آپ تو آپ ہیں یہ آئینے
کب کسی کا خیال کرتے ہیں
جانے کیوں لوگ سہم جاتے ہیں
ہم تو صرف آئینہ دکھاتے ہیں

.....

ملے گا کیا تمھیں اس رد و کد سے
بچا ہے کون آئینے کی زد سے

.....

میرے کہنے پر نہ آیا اعتبار
دیکھتے ہی آئینہ شرما گئے

افسوس کہ ناقدین نے اب تک قدیر تابانی کی شاعری کا جائزہ لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ورنہ ادبی دنیا میں ان کا اپنا ایک مقام ہوتا۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ قدیر اپنے آپ کو اردو دنیا سے متعارف کرانے میں پوری طرح تعاون نہ کر سکے۔ جبکہ ابتدا سے ہی انھیں اپنی نکھرتی ہوئی ادبی اور فنی صلاحیت پر پورا اعتماد تھا۔ اور سامعین کے مابین اپنی مقبولیت کا احساس بھی۔ ان کے درج ذیل اشعار بھی اس بات کے غماز ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

مشق اگر جاری رہی یوں ہی تو ارباب سخن
مجھکو بھی تسلیم کر لیں گے سخن ور دیکھنا

.....

اپنے ہر شعر میں جذبات کی عکاسی ہے
لوگ کیسے نہ بھلا دادِ سخن پیش کریں
کوششیں تو کیں بہت اہل سخن نے اے قدیر
پر کسی نے داد محفل میں نہ پائی میرے بعد

قدیر تابانی کا مجموعہ کلام ''حدیث دلبراں'' ۱۹۹۸ء میں اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوا۔ جس کے جملہ حقوق پر ''بزم اہل فن'' بارہ بنکی مدعی ہے۔ یہ مجموعہ آفسیٹ پرنٹنگ پریس لکھنؤ سے چھپا ہے۔ ایک سو چھتیس صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں موصوف کی تین نعتیں، دو سلام اور ایک سو ایک غزلیں شامل ہیں۔ مجموعہ کے ابتدا میں صفحہ بارہ، تیرہ پر منجانب خمار بارہ بنکوی اور تاباں شفیقی بعنوان ''دعائیہ''، ''میرا چہیتا شاگرد'' علی الترتیب چند سطور میں موصوف پر تبصرہ اور دعائیہ کلمات درج ہیں۔ تین صفحات ''عرض حال'' از مصنف، اور صفحہ سترہ تا تیس کا ایم، اے، انصاری (مشو) آذر بارہ بنکوی، شمیم حیدر ردولوی اور خلیل احسن ایم ،اے، کے علی الترتیب مضامین احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ جو شاعر اور کلام شاعر سے متعلق ہیں۔

اس مجموعہ میں بالخصوص غزلوں کے متن میں اس قدر کتابت کی غلطیاں ہیں کہ انھیں پڑھ کر طبعیت مکدر ہو جاتی ہے۔ اور تعجب ہے کہ بزم اہل فن بارہ بنکی اب تک اس طرف توجہ نہ دے سکی۔ پیش نظر مضمون میں شامل تمام اشعار اسی مجموعہ سے ماخوذ ہیں، البتہ کہیں کہیں خطوط سے اصلاح لی گئی ہے۔ یہ مجموعہ قدیر تابانی کی زندگی کا غالباً پہلا اور آخری مجموعہ ہے۔ سال اشاعت مجموعہ (۱۹۹۸ء) سے شاعر کے سال وفات .....تک کا کلام ابھی تک میں حاصل نہیں کر سکا ہوں جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اور اس علاقے کے قارئین سے اعانت کا متمنی بھی۔

زہے قسمت جو یہ مضمون اردو کے اس دیوانے کو اردو کے بہی خواہوں سے متعارف کرانے میں کچھ معاون ثابت ہو سکے۔ باقی رہا نام اللہ کا۔

حواشی:

۱ یہ بارہ بنکی کے بزرگ شاعر اور قدیر تابانی کے استاد تھے۔ ان کا انتقال ۹۸ء کے آس پاس ہوا۔

۲ یہ صاحب مجیب فتح پوری کے نام سے مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔

۳ شعری مجموعہ 'حدیث دلبراں'، قدیر تابانی، سن ۹۸ء، ص ۱۲

۴ ایضاً ص ۱۳

۵ بحوالہ اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل، ڈاکٹر ممتاز الحق، سن اشاعت دوم ۲۰۰۴ء، مطبع کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی، ص ۱۲

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نام کتاب: اسلام کا نظام سیاست وحکومت (ایک نخل تمنا، ایک شجر آرزو)
مصنف: پروفیسر محسن عثمانی ندوی
صفحات: ۱۹۲
قیمت: ۱۵۰
ناشر: نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، دہلی

اردو کے الہامی شاعر ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمہ نے کہا تھا؛

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہ ہو قوتِ شوکت کا پیام

ہندوستان کے معروف دانشور و مفکر اور نامور اردو نثر کی آبرو پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے اپنی اس تازہ تصنیف میں حکیم مشرق کے اسی شعر کی گویا تشریح کی ہے اور سچ یہ ہے کہ دل کو لگتی تشریح کی ہے، کہیں کہیں تلخ تنقیدیں اور لہجہ کی سختی در آئی ہے لیکن یہ سختی و تلخی بھی خدا لگتی ہے اس لیے قابل قبول ہی نہیں تقاضائے وقت کے عین مطابق ہے، پروفیسر عثمانی نے اس موضوع کو ایسے وقت میں چھیڑا ہے جبکہ تقریبا ذہنوں سے اس کا تصور بھی غائب ہو چکا ہے، اب تو صورت حال یہ ہے کہ بہت سے مذہبی لوگ اس کتاب کا نام پڑھ کر ہی کانپ جائیں گے، بہت سے لوگ مایوس کن لہجہ میں یہ کہہ کر ٹال دیں گے کہ دیوانے کا خواب ہے دیکھو کب تعبیر آئے، لیکن ایک محدود طبقہ ہے جس کے تصور دین کے مکمل تصور کی ترجمانی کرتے ہوئے صاحب کتاب نے اسلام کے نظام سیاست وحکومت کے وجود کو ایک نخل تمنا اور ایک شجر آرزو قرار دیا ہے۔

کسی موقع پر راقم نے لکھا تھا اور تجربہ ومشاہدہ کی بنیاد پر لکھا تھا کہ اب صورت حال یہ ہو چکی ہے کہ لوگ جس نظام میں رہ رہے ہیں اس کو اسلامی نظام سمجھ کر رہ رہے ہیں، جس نظام تعلیم سے استفادہ کر رہے ہیں اس کو اسلامی نظام تعلیم سمجھ کر استفادہ کر رہے ہیں، اگر ایسا نہیں تو کم از کم یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ اسلام اس سے راضی ہے، دین و دنیا اور شریعت وحکومت کی جامع، دین کی جو تصویر پیش کی گئی اس سے کچھ اس طرح توجہ ہٹتی چلی گئی کہ علاقہ کا علاقہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلتا رہا، ملک کے ملک غلام بنتے رہے، تہذیب وثقافت مٹتی رہی، اسلامی اقدار کا جنازہ اٹھتا رہا، بچے ذبح کیے جاتے رہے، عورتوں کی عصمت دری کی جاتی رہی نوجوانوں کو ناکارہ بنایا جاتا رہا فرعون وقت یذبحون أبناء کم ویستحیون نساء کم کی تصویر پیش کرتا رہا اور ہمارے یہاں یہی بحث چلتی رہی کہ دین و سیاست ایک ہیں یا جدا جدا، دعوت مقصد ہے یا حکومت، حکومت کے لئے کوشش کرنا چاہیے یا نہیں، معلوم نہیں قرآن مجید کی بشارتیں نظروں سے کیوں اوجھل ہو گئیں، کتب حدیث کے ابواب امارت کیوں پڑھے اور پڑھائے گئے، وأعدوا لهم ما ستطعتم من قوة میں ''قوۃ'' کا کیا مطلب سمجھا گیا، ترهبون به عدو الله وعدوكم کی قید کا کیا مفہوم سمجھا گیا، عرب دنیا تو بہت آگے نکل گئی، اس نے پہلے مغرب کی مصطلحات کو قبول کیا اور اب وہ ان مصطلحات کا نفاذ کرنے پر آمادہ نظر آرہی ہے، فکر اسلامی کو حجاز کے حدود اربعہ سے نکالنے کا مکمل فیصلہ کر لیا گیا ہے، فکری ارتداد کی جڑیں دن بدن گہری ہوتی جارہی ہیں، اس صورت حال میں پروفیسر عثمانی صاحب کا اس موضوع پر قلم اٹھانا انتہائی اہمیت کا حامل ہے، گزشتہ دس سالوں (جب سے میں ان کی تحریریں پابندی سے پڑھ رہا ہوں) میں انھوں نے بڑی بامقصد، حمیت دینی سے لبریز اور فکر اسلامی کی نمائندہ تحریریں پیش کی ہیں، کتاب کے پیش لفظ میں انھوں نے عہد حاضر میں اہل علم و دانش کے ہاتھوں میں کاسۂ گدائی کی کہانی ان کی کاسہ لیسی کی عادت اور بے جا بلکہ مجرمانہ مصلحت پسندی پر نقد کرتے ہوئے اگر اپنے

بارے میں خود ہی یہ دعویٰ کیا ہے تو بالکل بجا کیا ہے۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے، باب اول میں دین اور سیات کے رشتے کی وضاحت کی گئی ہے، بات کو کھول کھول کر دو دو چار کے انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ اسلام أفتومنون ببعض الکتاب کا قائل نہیں، وہ تفریق ناروا کو پسند نہیں کرتا، وہ وتکفرون ببعض کے ارشاد سے مکمل دین کی طرف متوجہ کرتا ہے، انھوں نے اسلام کے مزاج کی ترجمانی کی ہے اور بجا فرمایا ہے کہ اس کا مزاج یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام مسائل میں رہنمائی کرتا رہے، انھوں نے اس دین کی جامعیت پر روشنی ڈالی ہے، دین وریاست کے گہرے اور ضروری رشتہ کو مفصل انداز میں پیش کیا ہے، اس سلسلہ میں علامہ سید سلیمان ندوی اور مفکر اسلام مولانا علی میاں ندوی اور دیگر کبار رعلماء کی دل کو لگتی ہوئی حقیقت پسندانہ تحریریں نقل کی ہیں، مصنف کی نقل کردہ سید صاحبؒ کی ایک عبارت دیکھیے:

''اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد وایمان، شرائع واحکام اس کے لئے بمنزلہ تمہید تھے بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق وفرائض ہی اصل مطلوب تھے اور ایک حکومت صالحہ کا قیام ان کے لئے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے تاکہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل بہ آسانی کر سکیں۔ اس لئے وہ (حکومت اور اقتدار) بھی عرضا مطلوب ہے.....اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت و سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے۔ یہاں تک کہ کتاب ونبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے''۔(ص۳۱)

حکومت وسیاست سے کنارہ کشی کرنے اور ذہنوں میں اس کے محض دنیاوی عمل ہونے کا تصور بٹھانے اور اس کے نتیجہ میں سیاست وحکومت سے علحدگی اختیار کرنے کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف نے علامہ سید سلیمان ندوی کا ایک اقتباس نقل کیا ہے:

''ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ قیام سلطنت اور امور سلطنت میں دخل و تدبیر دنیا کا کام ہے۔ جس سے اہل علم اور اہل اتقا کو کنارہ کش رہنا چاہیے''۔(ص:۴۶)

مولانا علی میاں کی اس موضوع پر بہت صریح تحریریں ہیں، انھوں نے اس کا بھی اظہار کیا ہے کہ قوم میں سیاسی شعور پیدا کرنا انتہائی لازمی شے ہے، انھوں نے اس پر بھی توجہ دلائی ہے کہ اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے، اس کے لیے ایسا خوبصورت استدلال کیا ہے کہ پڑھیے اور سر دھنیے، مولانا کے مستدل کا خلاصہ یہ ہے کہ دین صرف اس لیے نہیں آیا کہ وہ درخواست کرے اور التماس کرے، وہ اقتدار چاہتا ہے وہ مقام بلند چاہتا ہے جہاں سے امر ونہی کا فریضہ انجام دیا جا سکے، قرآن نے ہر جگہ معروف کا حکم کرنے اور منکرات سے روکنے کے لیے امر ونہی کے صیغے استعمال کیے ہیں، جاننے والے جانتے ہیں کہ امر ونہی میں استعلاء پایا جاتا ہے، مولانا نے حرفت وصنعت اور اعداد قوت کی طرف بھی متوجہ کیا ہے، پروفیسر عثمانی نے مولانا کی متعدد تحریریں بطور استشہاد پیش کی ہیں، یہاں ہم ان کی پیش کردہ ایک تحریر کا ایک حصہ پیش کرتے ہیں:

''.....اور نہ میرا تعلق کبھی اس گروہ سے رہا ہے جو سیاست کو قرآن کے شجرۂ ملعونہ کا مصداق سمجھتا ہے، میں ان لوگوں کی اگلی صف میں ہوں جو مسلمان قوموں کی صحیح سیاسی شعور کے داعی ہیں اور ہر اسلامی ملک میں صالح قیادت کو بروئے کار دیکھنا چاہتے ہیں میں ان لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ دینی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتا جب تک دین کو اقتدار حاصل نہ ہو اور حکومت کا نظام اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہو، میں اس کا داعی ہوں اور زندگی کی آخری سانس تک رہوں گا''۔(ص۳۷)

باب دوم میں اسلام کے سیاسی نظام کی ہیئت سے بحث کی گئی

ہے، اس کے شورائی نظام کی تشریح کی گئی ہے، امیر کے اختیارات و حدود کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، امیر کے انتخاب کے طریقۂ کار اور اس کی مدت کے سلسلہ میں علماء کے اقوال کو پیش کر کے بحث کی گئی ہے، اسلام کے نظام حکومت کو امارت و شورائیت کا امتزاج قرار دیا گیا ہے، انھوں نے متعدد دلائل کی بنیاد پر اسلامی جمہوریت کے قیام کو فرض بھی قرار دیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات ان ہی ممالک کے بارے میں کہی گئی ہے جن کو اسلام کا گہوارہ کہا جاتا ہے، اور غلط طور پر جنہیں اسلامی ممالک کہا جاتا ہے، اس باب میں مصنف نے مروجہ جمہوریت سے فائدہ اٹھانے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔

ایک نئی بات یہ ہے کہ اس کتاب میں مصنف نے جا بجا ''اسلامی جمہوریت'' کی اصطلاح خلافت کے معنی میں استعمال کی ہے مگر یہ خوبصورت وضاحت بھی کی ہے:

''جیسا کہ کئی بار ذکر آچکا ہے ہم نے اسلامی جمہوریت کی اصطلاح توضیح و تفہیم کے لیے استعمال کی ہے ورنہ یہ منصوص اصطلاح نہیں ہے مقصد یہ ہے کہ اسلامی حکومت کو بادشاہت یا مطلق العنان آمریت ہرگز نہ سمجھا جائے، اصل اصطلاح تو خلافت کی ہے لیکن مطالعہ کی کمی کی وجہ سے اور غلط نظام حکومت کے تسلسل کی وجہ سے ایک عام قاری کا ذہن خلافت کی اس اہم جمہوری روح کی طرف منتقل نہیں ہو سکے گا''۔ (ص ۶۶-۶۷)

اس کتاب میں دین کا مزاج کس طرح پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی افادیت کیا ہے، اس کے لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی، مصنف کی فکر کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے مصنف کا یہ اقتباس پڑھیے جو انھوں نے اس باب کی ابتدا میں لکھا ہے، یہ اقتباس کے الفاظ درد انگیز نالے ہیں، باحمیت مصنف کے قلم سے ٹپکنے والے آنسو ہیں جو قرطاس پر الفاظ کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں:

''مسلمانوں کی بڑی تعداد مختلف اثرات کے تحت یہ نہیں جانتی ہے کہ خلافت کا قیام واجب ہے اور اسلامی حکومت کا قیام ضروری ہے کسی کو امیر یا امام یا خلیفہ منتخب کرنا لازم ہے۔ یہ تصور عام طور پر اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ سیاست اور چیز ہے اور دین دیگر شے ہے، اچھے اخلاق کو اور عبادات کو سب ہی دین سمجھتے ہیں، اور اگر انسان کسی صحراء میں زندگی بسر کرتا ہے یا ایسے ملک میں رہتا ہے جہاں مسلمان بہت کم ہیں اور چھوٹی سی اقلیت میں ہیں تو وہاں بااختیار حکومت کا سوال نہیں ہے اس لئے دین کا وہ پہلو جس کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور پھر بتدریج دین کا ناقص تصور دل و دماغ میں جڑ پکڑ لیتا ہے اور پھر مسلم ملکوں میں اگر اسلام کا نظام ناپید ہو، اسلامی حکومت کے قوانین نافذ نہ ہوں، مغرب کے بنائے ہوئے لادینی قوانین پر عمل ہو رہا ہو تو اس کے دل کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہے۔ دین اور سیاست کی علحدگی کا مغربی تصور غیر شعوری طور پر دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اب اگر کسی مسلم ملک میں نفاذ شریعت کی کوئی تحریک اٹھتی ہے تو وہ اس تحریک کا دور سے تماشائی ہوتا ہے اس کا جسم تو اس تحریک سے دور ہوتا ہی ہے اس کا دل بھی اس تحریک سے دور ہو جاتا ہے اور اگر اس نفاذ شریعت کی تحریک کے قائدین کو موت کی سزا دی جائے تو ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے وہ دل میں کوئی درد محسوس نہیں کرتے۔ یہ حال صرف عوام کا نہیں بلکہ خواص کا اور علماء کا بھی ہو جاتا ہے اور یہ اس لئے کہ دین کا غلط تصور ان کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو گیا ہے۔ اصلاح و تبلیغ کی بڑی بڑی تحریکیں اٹھتی ہیں ان کے مبلغین اور ان کے عوام و خواص کے یہاں بھی دین کی جامعیت کا تصور نہیں پایا جاتا ہے۔ ایک چیز ہے دین کے تمام گوشوں کو سماج میں نافذ کرنا، تمام حالات میں اور تمام ملکوں میں یہ ممکن نہیں ہے لیکن کم از کم دین کا صحیح تصور ذہن میں موجود رہنا چاہیے اور دنیا میں جہاں جہاں پورے دین کی اقامت کی کوششیں ہو رہی ہیں اور لوگ پابجولاں عقوبت خانوں میں لے جائے جا رہے ہیں ہمارے قلبی اور جذباتی وجود کو ان کے ساتھ ہونا چاہیے ان کے لئے ہماری آنکھوں میں آنسو اور زبان پر دعا ہوئی چاہیے''۔ (ص ۴۰-۴۱)

اس باب میں اسلام کے سیاسی نظام کی وضاحت کی گئی ہے، اسلامی ریاست کے قیام کی ضرورت کو پیش کیا گیا ہے، اسلامی

ریاست کی ذمہ داریاں یاد دلائی گئی ہی اور اسی ضمن میں ''اسلامی ریاست اور حکم جہاد'' کے عنوان سے جہاد کی انتہائی متوازن اور درست تشریح کی گئی ہے، یہ تشریح بہت مختصر ہے مگر بڑی حد تک لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کیے جانے والے خلجانوں کو دور کرنے کے لیے کافی ہے۔

کتاب کے تیسرے باب میں موجودہ عالم اسلام کی سیاسی صورت حال پر بحث کی گئی ہے، مسلم حکومتوں کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ ان حکومتوں کو مسلمانوں کی حکومت تو کہا جاسکتا ہے مگر اسلامی حکومت نہیں قرار دیا جاسکتا، اور یہ صحیح موقف ہے بلکہ بسا اوقات ان حکومتوں کے رویے مسلم حکومت کے رویے بھی نہیں قرار دیے جاسکتے۔انھوں نے اس باب میں حقیقت پسندانہ تبصرے کیے ہیں اور صراحت سے لکھا ہے کہ آج کی عرب حکومتوں سے اسلام کو نقصان زیادہ پہنچا ہے، اس باب میں بہار عرب کا بھی ذکر ہے، اور احتجاج وتنقید پر حرمت کا فتوی دینے والوں اور خلط مبحث کرتے ہوئے احتجاج وتنقید اور غیر اسلامی عمل کرنے والے مغرب کے پروردہ مسلح لوگوں نیز مظلوم مسلح شہریوں کی مسلح بغاوت کو ناجائز قرار دینے والوں کا اچھا مدلل ومفصل محاکمہ کیا گیا ہے، یہ وہ باب ہے جس میں علماء حق اور علماء سوء کا چہرہ بھی نمایاں کیا گیا ہے اور ان کو ان کے فرائض منصبی بھی یاد دلائے گئے ہیں، ان کی ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کیا گیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب عرب دنیا کو سامنے رکھ کر ترتیب دی گئی ہے اور مسلم ممالک کی حکومتوں اور ان کے مسائل کا ہی تجزیہ کیا گیا ہے، البتہ اس ضمن میں عام طور پر دین کے صحیح اور مکمل تصور کا قضیہ بھی زیر بحث آیا ہے اور خوب آیا ہے، ذہنوں سے محو ہوتے اس تصور کو ذہن وقلب میں تروتازہ رکھنا اور مولانا علی میاں کے قلم سے لکھے گئے ''شہدائے بالا کوٹ کے پیغام'' کو نخل آرزو بنا کر اس کی پرورش کرنا اسلامی عقل اور اسلامی جذبات وحمیت کا تقاضہ ہے۔

مصنف لائق صد مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ظلمت کدے میں اذان دی، آوازۂ تجدید بلند کیا، امیدوں کا دیا جلایا، امیدیں پلتی رہتی ہیں تو کبھی نہ کبھی برگ وبار ضرور لاتی ہیں، امید ہی نہ ہو تو پھر قوت عمل ہی معطل ہوجاتی ہے، مغرب کا سارا زور اس پر ہے کہ اسلام کے جامع تصور کو ختم کرکے اس کے حصے بخرے کر دیے جائیں جس کے لیے اس نے صوفی اسلام، معتدل اسلام، اجتماعی اسلام، سیاسی اسلام اور متشدد اسلام کی اصطلاحات وضع کی ہیں، وہ عرصہ سے اس پر کام کر رہا ہے، اس کا کام اپنی انتہا کو پہنچ رہا ہے، بلکہ یہ کہیے کہ اب وہ فصل کاٹ رہا ہے، سعودیہ میں جو کچھ نظر آرہا ہے یہ مغرب کی تیار کردہ فصل ہے، ان حالات میں پروفیسر عثمانی نے علمائے عزیمت کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اس موضوع پر قلم اٹھا کر ملت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے، اردو میں تو اس کی ضرورت تھی ہی کہ کم از کم یہ تصور زندہ رہے لیکن اس کتاب کے اصل مخاطب اہل عرب اور ان کے ہمنوا وہم خیال ہیں اس لیے ضروری ہے کہ اس کو عربی وانگریزی میں جلد از جلد شائع کیا جائے اور اشاعت کے بجائے سوشل میڈیا کے ذریعہ اس کو ملک در ملک اور گھر گھر پہنچایا جائے، خدا کرے کہ تمناؤں کا یہ پودا شجر سایہ دار بن جائے،

آخر میں یہ عرض کر دینا راقم اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے کہ نثری دنیا میں پروفیسر عثمانی اپنی جداگانہ شناخت رکھتے ہیں، لیکن اس کتاب میں متعدد مقامات پر ربط ٹوٹتا نظر آتا ہے، بعض مقامات پر پڑھتے پڑھتے توقف ہوتا ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس میں متعدد مضامین وہ ہیں جو الگ الگ لکھے گئے اور شائع ہوئے، بعد می اس موضوع کے تحت ان کو شامل کتاب کیا گیا، اگر دوسرا ایڈیشن آنے سے قبل محترم مصنف نے بغرض تنقیح ایک نظر ڈال لی تو اس کتاب میں چار چاند لگ جائیں گے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ
ہمدرد نگر ڈی کوارسی بائی پاس روڈ جمال پور علی گڑھ

Madrasatul Uloom Al- Islamia
Hamdard Nagar D Jamalpur Aligarh U.P. India

اعلان مسابقہ بین الدارس

محترمی ومکرمی جناب ناظم/مہتمم صاحب (مدرسہ.....)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہوں گے۔

''علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن'' آپ کی دعاؤں کے نتیجہ میں علمی، فکری اور تعلیمی وسماجی میدانوں میں کسی نہ کسی حالت میں اپنی خدمات انجام دے رہا ہے، جس کی اطلاعات جناب والا کو پہنچتی رہتی ہوں گی۔

فاؤنڈیشن کے زیر انتظام ادارہ ''مدرسۃ العلوم الاسلامیہ'' میں سالانہ انعامی مقابلے صرف مدرسہ کے طلبہ کے درمیان ہی نہیں نہیں کرائے جاتے بلکہ ضلعی سطح پر بین المدارس اور عصری اسکولوں کو شامل کر کے یہ مقابلے ہوتے ہیں۔

سال ۱۵-۲۰۱۴ء میں انتظامیہ نے یہ طے کیا تھا کہ یہ مقابلے صوبائی سطح پر منعقد ہوں اور دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ملحق اتر پردیش کے ان مدارس کو اس میں شامل کیا جائے جہاں کم از کم عالیہ اولیٰ تک تعلیم ہوتی ہے۔ اسی طرح فاؤنڈیشن نے علی گڑھ کے اسکولوں کے درمیان بھی سائنس اور دینیات کمپیٹیشن منعقد کیا تھا، ان مقابلوں کے نتائج بہت اچھے اور طلبہ کے لئے حوصلہ افزا تھے، طلبہ کے تاثرات سے محسوس ہوا تھا کہ انھوں نے ان مقابلوں سے بہت کچھ حاصل کیا۔ درمیان میں دو سال فاؤنڈیشن اس سطح پر مقابلے منعقد نہ کر سکا، الحمدللہ اس بار پھر فاؤنڈیشن نے صوبائی سطح پر مقابلے کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ طلبہ کی فکری وثقافتی تربیت اور ان کے مسابقاتی ذہن کو تشکیل دینے والے اس پروگرام میں ہمارا علمی فکری اور بہر اعتبار بہتر سے بہتر تعاون فرمائیں گے، اور اپنے طلبہ کو اس مقابلے میں شرکت کے لئے اپنی ذمہ داری سمجھ کر ضرور بھیجیں گے، یہی ہمارا سب سے بڑا تعاون ہے۔

عناوین اور شرائط کے صفحات منسلک ہیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء

والسلام

محمد طارق ندوی رامپوری

سرپرست جمعیۃ الاصلاح

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ

رابطہ اور معلومات کے لئے:

allupcompetition@gmail.com
www.nadwifoundationaligarh.org
محمد طارق ندوی رامپوری: 7417763557
محمد حسین ندوی: 7500598623

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ
ہمدرد نگر ڈی کوارسی بائی پاس روڈ جمال پور علی گڑھ

Madrasatul Uloom Al- Islamia
Hamdard Nagar D Jamalpur Aligarh U.P. India

شـــــرائـط

۱۔ ۱۰؍فروری تک شرکت کی اطلاع بذریعہ ای میل یا فون دینا لازمی ہے۔
۲۔ ۲۰؍فروری تک وقت آمد اور ٹرین کے نام وغیرہ سے ضرور مطلع کریں۔
۳۔ ۲۷؍فروری کی صبح تک ضرور تشریف لے آئیں، افتتاحی پروگرام انشاءاللہ ۲۷؍فروری کی صبح کو ہوگا۔
۴۔ ہر مقابلے کے دونوں گروپ میں ایک مدرسہ کے صرف دو- دو طلبہ شریک ہوسکیں گے۔
۵۔ شرکت کے لئے لازمی ہے کہ ہمارے ذریعہ ارسال کئے گئے فارم پر دفتر اہتمام کی مہر کے ساتھ بذریعہ ای میل یا ڈاک اطلاع دی جائے۔
۶۔ طبقہ علیا کو تقریر کے لئے زیادہ سے زیادہ ۸؍منٹ دئے جائیں گے، اور سفلی کو ۶؍منٹ۔ **مساہمین کی تعداد کو دیکھتے ہوئے وقت میں تخفیف کی جاسکتی ہے۔**
۷۔ مقالہ A-4 سائز کے کم از کم دس صفحات پر مشتمل ہو، ۱۰؍فروری تک مقالہ بذریعہ ای میل یا ڈاک موصول ہونا لازمی ہے، پیشگی آنے پر اس کا چیک کرنا ممتحن حضرات کے لئے آسان ہوگا۔
۸۔ ۱۰۰؍نمبر مقالہ خوانی اور ۱۰۰؍نمبر مقالہ نگاری کے ہوں گے۔
۹۔ مقالہ خوانی کے لئے تلخیص ساتھ لائیں جو ۷؍منٹ میں پیش کی جاسکے۔
۱۰۔ **طلبہ کی آمد و رفت کا خرچ خود ان پر یا ان کے مدرسہ پر ہوگا۔**

عناوین:

(۱) اردو مقالہ نگاری
علیا: دارالمصنفین کی علمی خدمات
سفلی: اسلام کی اخلاقی تعلیمات سیرت النبی ششم (سید سلیمان ندوی) کی روشنی میں

(۲) اردو تقریر
علیا: عالم اسلام کی موجودہ صورتحال اور ہماری ذمہ داریاں
سفلی: اسلام میں مذہبی رواداری

(۳) عربی تقریر
علیا: الصراع بين المادية والإسلام
سفلی: الإسلام للبشرية جمعآء

(٤) انگریزی تقریر
علیا: **Islam and Terrerism**
سفلی: **Moral Values and Teachings of Islam**

(۵) بیت بازی:
☆اردو ☆عربی

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم
مدرسۃ العلوم الاسلامیہ
ہمدرد نگر ڈی کوارسی بائی پاس روڈ جمال پور علی گڑھ
Madrasatul Uloom Al- Islamia
Hamdard Nagar D Jamalpur Aligarh U.P. India

پروگرام کی تفصیل حسب ذیل ھے:

۱۔ یہ مقابلے ۲۷، ۲۸ رفروری و یکم مارچ کو ہوں گے، افتتاحی پروگرام ۲۷ رفروری کی صبح کو ہوگا۔

۲۔ یہ مقابلے اردو مقالہ نگاری، عربی، اردو اور انگریزی تقریر، عربی بیت بازی، اردو بیت بازی اور نحو وصرف کوئز پر مشتمل ہوں گے۔

۳۔ اردو، عربی، انگریزی تقریر اور اردو مقالہ نگاری میں علیا وسفلی دو گروپ ہوں گے، بقیہ مقابلوں میں علیا وسفلی کی کوئی تفریق نہیں ہوگی۔ صرف انگریزی تقریر کے دونوں گروپ میں مدارس کے ساتھ علی گڑھ کے اسکولوں کے طلبہ کو بھی مدعو کیا گیا ہے۔

۴۔ سفلی گروپ ثانویہ ثالثہ تاثانویہ خامسہ اور علیا گروپ ثانویہ سادسہ تاعالیہ ثالثہ پر مشتمل ہوگا۔

۵۔ بیت بازی میں ہر مدرسہ کی دو طلبہ پر مشتمل ٹیم ہوگی، عربی بیت بازی تو روایتی انداز میں ہوگی، لیکن اردو بیت بازی روایتی انداز سے ہٹ کر ہوگی، جس کا طریقہ یہ ہوگا کہ پہلے راؤنڈ میں تمام ٹیموں کو آخری حرف سے، دوسرے راؤنڈ میں صدر جلسہ اساطین ومشاہیر شعراء میں سے کسی کا نام لیں گے جس کے کلام سے شعر پڑھنا ہوگا، اور تیسرے راؤنڈ میں صدر محترم کوئی لفظ دیں گے جیسے رب، دل، جگر وغیرہ، طالب علم کو ایسا شعر پڑھنا ہوگا جس میں وہ لفظ مستعمل ہو۔

۶۔ نحو وصرف کا مقابلہ فیض النحو اور کتاب الصرف پر مشتمل ہوگا۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ پہلے مرحلہ میں ۵۰ رسوال Objective انداز کے دیئے جائیں گے، اس طور پر کہ ایک سوال کے چار جواب لکھے ہوں گے، ان میں سے صحیح جواب پر ٹِک لگانا ہوگا، مثال کے طور پر:

فاعل کا اعراب کیا ہوتا ہے؟

(۱) مرفوع (۲) منصوب (۳) مجرور (۴) تینوں میں سے کوئی نہیں

پھر اس میں کامیاب ہونے والے طلبہ کے درمیان کوئز کا مقابلہ ہوگا، اس طور پر کہ پہلے سے نحو وصرف کے مسائل پر مشتمل سوالات کی پرچیوں میں سے صدر محترم کوئی پرچی اٹھا کر بچہ سے سوال پوچھیں گے۔

۷۔ آنے والے طلبہ کو قیام وطعام کی سہولت دی جائے گی، اسٹیشن سے انہیں رسیو کیا جائے گا، ہر مسابقہ اور ہر گروپ میں اول، دوم سوم اور تشجیعی انعامات دئے جائیں گے، ہر انعام کتابوں، نقد رقم، سند اور شیلڈ پر مشتمل ہوگا۔

۸۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ جس مدرسہ کے طلبہ تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ انعامات حاصل کریں گے اس مدرسہ کو ایک بڑی ''سید سلیمان ندوی ٹرافی'' دی جائے گی، اسی طرح دوسری پوزیشن حاصل کرنے والے مدرسہ کو ''ابوالحسن علی ندوی ٹرافی'' دی جائے گی۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم
Madrasatul Uloom Al- Islamia
Hamdard Nagar D Jamalpur Aligarh U.P. India
مدرسۃ العلوم الاسلامیہ
ہمدرد نگر ڈی کوارسی بائی پاس روڈ جمال پور علی گڑھ

Competition Between All Schools In Aligarh

To,

The principal/Director/Head of ……..……..

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

May the mercy and blessing of Allah be upon you.

As you know very well that Allama Abul Hasan Ali Nadwi educational and welfare foundation, Aligarh, as an active educational movement, has been running with its excellent services in various educational fields for the last few years. At the district level, the foundation has held different types of cultural and presentable contests aimed purely to promote the students' ideological, mental and educational abilities.

In the session of 2014-15 the foundation held the competition of Science and Islamic Studies at district level and various schools of Aligarh participated in it. The ABK Union school (boys) was winner of the Ibnul Haitham trophy. The list of quiz winners is also attached here.

This year also the Foundation has a plan for organizing "Science and Islamic Studies Quiz" and "English Speech Competition" among the students of all schools in Aligarh. We hope you ensure participation of your students in competition with full preparation.

Please see the details enclosed. Winners will be awarded with a prize, which will consist of cash, books, shields and certificates of merit.

We thank you for your great cooperation in the past, and look forward to receive your help in this program also.

Thanking you.

Dr.M. Tariq Ayubi Nadwi

Principal

Madrasatul Uloom Al Islamia

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Madrasatul Uloom Al- Islamia
Hamdard Nagar D Jamalpur Aligarh U.P. India

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ
ہمدرد نگر ڈی کوارسی بائی پاس روڈ جمال پور علی گڑھ

1) The Competition will be divided into 2 groups.
(Group "A" Class 3rd to 5th, Group "B" Class 6th to 8th)
2) The Quiz Competition will be comprised of 100 objective questions, 70 questions of Science and 30 of Islamic Studies. Answers will be checked with Negative marking (0.25 mark on each incorrect answer)
3) 40% Marks in Islamic Studies is compulsory for qualifying the competition.
4) The Questions will be from the current Syllabus of the Schools.
5) The Science, Islamic Studies Quiz Competition will be held on 24st December 2017 at 10:00 am. to 11:30, and English Speech Competition will be on 28th February 2018 during All U.P. Madrasa Competition. Madarsa Students also will take part in English Speech Competition.
6) The Result of Science-Islamic Studies Quiz will be declared on 15th January 2018. It may be seen on our Website. The Concerned School also will be informed.
7) The Prizes will be distributed on 1st March 2018 in the Annual Function of Madrasa in the presence of Excellencies and dignities.
8) Each Prize will consist of Cash, Books, Shields and Merit Certificates.
9) Quiz will have 3 main Prizes along with 5 Consolation Prizes while English Speech Competition will have 3 main Prize along with 1 Consolation Prize.
10) English Speech Topics:
Group-A: Moral Values and teachings of Islam.
Group-B: Islam and Terrorism.
11) The Last Date of Registration is 30th November 2017. The Hall Ticket at the end of this Page should be photocopied. Each Participant should Fill it and Send it by Email or submit it in the Office of Madrasatul Uloom Al Islamia for each contest with the seal and sign. of Principal of the Concerned School.
12) The Hall Ticket will be sent to the Principal of the concerned school till 7th December 2017 or it can be collected from the Office of Madrasatul uloom al islamia.
13) The School - whose Participants will win more awards than other School's Students - will be awarded with IBNUL HAITHAM TROPHY.

***

فارم برائے شرکت

نام طالب علم .....نام مدرسہ .....

درجہ .....گروپ .....

کس مسابقہ میں شرکت مطلوب ہے .....

پتہ .....

رابطہ نمبر .....

دستخط ومہر دفتر اہتمام

.....

نوٹ: اس کو ضرورت کے اعتبار سے فوٹو کاپی کرالیں یا ہماری ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کرلیں۔

Hall Ticket

Attested Recent Photo

Roll No. *(For Office Use)*_____

Student's name:_____

Father's name:_____

Class:_____

School:_____(Gender)_____

Contest's name:_____

Student's contact number:_____

School's contact Number_____

Date and Time *(For office use)* _____

Test Center*(For office use)*_____

Seal and Sign of Concerned School _____

آخری صفحہ

اسلام میں سب برابر ہیں

(م۔ق۔ن)

حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں قبیلۂ غسان کا حکمراں جبلہ ابن ایہم عیسائیت سے تائب ہوکر مشرف بہ اسلام ہوا تھا، حضرت عمر فاروقؓ اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ اس کے شاہی لباس یریں حصے (نیچے کے حصہ) پر کسی بدوی (دیہاتی) کا پاؤں پڑ گیا، جبلہ نے بدوی کی اس حرکت کو اہانت تصور کیا اور اس کے ایک تھپڑ مار دیا، بدوی نے اس کی شکایت امیر المومنین حضرت عمرؓ سے کی، حکم ہوا کہ جبلہ کو حاضر کیا جائے، جبلہ نے تھپڑ مارنے کا اعتراف تو کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ بیٹھا کہ میں ایک ملک کا حکمراں ہوں جب کہ یہ حقیر بدو ہے، اگر میں نے ایک طمانچہ لگا بھی دیا تو اس کی شان میں کیا فرق آ گیا، امیر المومنین نے فرمایا: اسلام میں سب برابر ہیں، اس سے معافی مانگو، اگر اس نے برضا و رغبت اور خوشی خوشی معاف کر دیا تو معاملہ ختم ورنہ بدلہ دینا ہوگا، جبلہ نے ایک دن کی مہلت طلب کی جو اسے دے دی گئی، اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر وہ رات کی تاریکی میں بھاگ گیا اور مرتد ہوگیا، یہ حقیقت ہے کہ اسلام کو اس کے ارتداد سے کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ اسلام میں سب برابر ہیں تاریخ اسلام کا ایک قابل افتخار سرمایہ بن گیا، عدل و مساوات کے عملی نمونوں سے تاریخ اسلام کے صفحات بھرے پڑے ہیں، ان میں صرف ایک نمونہ اوپر پیش کیا گیا، ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے عدل و مساوات کا صرف حکم ہی نہیں دیا بلکہ اس کو عملی شکل میں بھی دنیا کے سامنے رکھا، اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے طبقاتی منافرت اور ذات پات کی اونچ نیچ کے فرق کو روز اول سے ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر اس تعلیم کو اس نے نظریاتی افق تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اسے عملی تطبیق بھی فراہم کی۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول عربیؐ کے آخری خطبے کے یہ الفاظ نسلی غرور کے خاتمہ کا واضح اعلان ہیں، آپؐ نے فرمایا: "یا ایھا الناس ان ربکم واحد وان أباکم واحد کلکم لآدم وآدم من تراب ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم لیس لعربی علی عجمیٍ فضل إلا بالتقویٰ" (مسند امام احمد بن حنبل) اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، تم سب آدم سے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں، تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ متقی ہے، کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں بہ جز تقویٰ کے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت عدل کی ایک اعلیٰ مثال قائم کر دی، جب آپؐ کی خدمت میں حضرت اسامہؓ ایک مخزومی عورت کی (جس نے چوری کی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا عزم کر لیا تھا) شفارش لے کر آئے آپؐ نے فرمایا: اے اسامہ کیا تم اللہ کی حد میں سفارش کر رہے ہو؟ خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹتا (بخاری و مسلم) یہ ہے وہ عام اور مطلق عدل جو بڑے چھوٹے، حاکم محکوم، امیر فقیر، مسلم غیر مسلم ہر ایک پر نافذ ہوتا ہے، اس کی گرفت سے کوئی شخص آزاد نہیں، عدل کا یہی وہ مقام ہے جس سے اسلامی معاشرہ دیگر معاشروں سے ممتاز اور نمایاں نظر آتا ہے، تاریخ اسلامی عدل کے ان زریں واقعات سے پُر ہے، ضرورت ہے کہ مسلم حکومتیں بلکہ دنیا کی تمام حکومتیں ان کو اپنے لیے نمونہ بنائیں۔

☆☆☆